Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

بعثتِ خاتم الانبیاءﷺ، بیداری کا آغاز

پیغمبر اکرمﷺ کا اہم ترین کام حق اور حقیقت کی طرف دعوت اور اِس دعوت کی راہ میں جہاد تھا۔ آپؐ اس دور کی تاریک دنیا کو اپنے مدِّمقابل دیکھ کر گھبرائے نہیں، حالانکہ آپؐ مکہ میں تنہا تھے یا آپؐ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک مختصر تعداد تھی، جبکہ آپؐ کے مقابلے میں متکبر عربوں کے سردار اور قریش کے بڑے بڑے سرکش اور ضدی لیڈر تھے، جو انتہائی بداخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری و مادی طاقت اور ہر طرح کے وسائل سے بھی لیس تھے یا آپؐ کا سامنا ایسے عوام الناس سے تھا جو علم و معرفت سے بالکل بے بہرہ تھے۔ ایسے ماحول میں بھی آپؐ پریشان نہیں ہوئے، بلکہ اپنی سچی بات کا مسلسل اعلان کرتے ہوئے اپنےموقف کو واضح کرتے رہے۔ آپؐ نے اپنی توہین کا سامنا کیا، رنج و مشقت برداشت کی، اپنی جان کے لیے خطرات مول لیے، تب جاکر لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو دائرۂ اسلام میں داخل کر سکے۔

اور اسی طرح جب مدینہ میں آپؐ نے اسلامی حکومت قائم کی اور خود اس حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، تو مختلف دشمنوں سے آپؐ کا آمنا سامنا ہوا، کہیں اسلحہ سے لیس عرب کے مختلف وحشی گروہ تھے، جو حجاز اور یمامہ[1] کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے اور آپؐ نے اسلام کی دعوت کے ذریعے ان کی اصلاح کرنی تھی، جبکہ وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہے تھے، تو کہیں وقت کی دو بڑی سلطنتوں، یعنی ایران اور روم کے بادشاہوں کی طرف آپؐ نے خطوط ارسال فرما کر انہیں دینِ اسلام کی طرف دعوت دی جو آپؐ کے خلاف تھیں، آپؐ نے اسلام کی تبلیغ و ترویج کے لیے بحث و مباحثہ کیے، ادلہ و براہین پیش کیے، جنگیں لڑیں اور بہت سی سختیاں برداشت کیں، اقتصادی بائیکاٹ کا سامنا کیا، یہاں تک کہ بعض اوقات اہلِ مدینہ دو تین دنوں تک بھوکے

۱۔ سرزمین عرب میں نجد اور بحرین کے درمیان کا ایک وسیع و عریض علاقہ جس میں بے شمار دیہات، قلعے، چشمے اور باغات پائے جاتے تھے۔

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

رہنے پر مجبور ہوتے تھے، چاروں طرف سے مصیبتوں نے آپؐ کو گھیرے ہوئے تھا۔

ایسے حالات میں کچھ لوگ پریشان ہو جاتے تھے، تو کچھ افراد کے قدم ڈگمگانے لگتے تھے، کچھ لوگ اعتراض کرنے لگتے تھے جبکہ کچھ حضور اکرمﷺ سے اسلام دشمن عناصر کے ساتھ نرمی اور ملائمت اختیار کرنے کی سفارشیں کرتے تھے؛ لیکن آپؐ دعوت و جہاد کے میدان میں کبھی پیچھے نہ ہٹے اور پوری قوت و سرفرازی کے ساتھ اسلامی معاشرے کو عزت و اقتدار کی بلندی تک پہنچایا۔ جنگوں میں حضور اکرمﷺ کی اسی استقامت و پائیداری اور آپؐ کی دعوت کی بدولت، آنے والے برسوں میں یہ اسلامی حکومت دنیا کی منفرد طاقت کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔

(۲۷/۰۹/۱۹۹۱ء)

رسول اکرمﷺ نے اپنی ایک متواتر اور مشہور حدیث میں فرمایا: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ''[۱] ''مجھے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔'' بعثت کا بنیادی مقصد اور ہدف ہی یہ تھا کہ اخلاقی عظمتیں اور انسان کی روحانی فضیلتیں دنیا میں عام ہو جائیں اور انسان اپنے کمال کو پہنچے۔ جب تک کوئی شخص اِن اخلاقی عظمتوں کا بذاتِ خود مالک نہ ہو، اللہ تعالیٰ اسے ایسی عظیم اور سنگین ذمہ داری نہیں سونپتا ہے، لہٰذا بعثت رسول اکرمﷺ کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ آپؐ سے مخاطب ہوکر ارشاد فرماتا ہے: ''وَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ''[۲] پیغمبر اسلامﷺ کو اللہ تعالیٰ کی وحی کے لیے مناسب اور شائستہ بنانے اور سنوارنے کا آغاز، بعثت سے پہلے ہی ہوا تھا۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ آپؐ جب اپنی جوانی کے دور میں تجارت کیا کرتے تھے تو اِس تجارت سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی کو راہِ خدا میں بطورِ صدقہ غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

اسی زمانے کی بات ہے یعنی پیغمبر اسلامﷺ تکامل کے آخری مراحل میں تھے اور ابھی نزولِ وحی کا آغاز نہیں ہوا تھا، یعنی اس وقت آپؐ مبعوث بہ رسالت نہیں ہوئے

۱۔ شرح اصول کافی، ملا صدرا، ج۱، ص۴۲۰

۲۔ یقیناً آپؐ خلق عظیم کے مالک ہیں۔ (سورہ قلم، آیت ۴)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

تھے، آپؐ "حرا" کی پہاڑی پر جا کر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا بغور جائزہ لیتے تھے، آپؐ آسمان، ستاروں، زمین اور زمین میں بسنے والی تمام مخلوقات کو جو مختلف طریقوں اور احساسات کے ساتھ زندگی گزارتی ہیں، کا دقّت کے ساتھ مشاہدہ فرماتے اور ان سب میں اللہ کی نشانیوں کی تجلی پاتے تھے، جس کے نتیجے میں روز بروز حق کے مقابلے میں خضوع اور اوامر و نواہی اور ارادہ الٰہی کے مقابلے میں آپؐ کے دل کے خشوع میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اور آپؐ کے وجودِ مبارک میں اخلاقیات کی جڑیں روز بروز مضبوط ہوتی جاتی تھیں۔ روایت میں ہے کہ "کَانَ اَعقَلَ النَّاسِ وَأَکرَمَهُم" یعنی "پیغمبر اسلامﷺ بعثت سے قبل ہی لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند اور محترم تھے۔" آپؐ روزانہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے مشاہدے سے فیضیاب ہوتے تھے۔یہاں تک کہ آپؐ چالیس سال کی عمر کو پہنچ گئے: "فَلَمَّا استَکمَلَ أَربَعِینَ سَنَةً وَنَظَرَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ إِلَىٰ قَلبِهِ فَوَجَدَهُ أَفضَلَ القُلُوبِ وَأَجَلَّهَا وَأَطوَعَهَا وَأَخشَعَهَا وَأَخضَعَهَا"؛ یعنی چالیس سال کی عمر میں آپؐ کا قلبِ مبارک سب کے دلوں سے زیادہ نورانی، خاشع اور وحیِ الٰہی کو قبول کرنے کے لیے سب سے زیادہ شائستہ و سزاوار تھا۔ "أَذِنَ لِأَبوَابِ السَّمَآءِ فَفُتِحَت وَمُحَمَّدٌ یَنظُرُ إِلَیهَا"؛ یعنی جب آپؐ معنویت اور روحانیت کے اعتبار سے کمال کے اِس درجے پر پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر آسمانوں اور عالمِ غیب کے دروازے کھول دیئے اور آپؐ کی آنکھوں کے سامنے معنوی اور غیبی جہانوں کے دروازوں کو کھول دیا۔ "وَأَذِنَ لِلمَلَائِکَةِ فَنَزَلُوا وَمُحَمَّدٌ یَنظُرُ إِلَیهِم"[1] آپؐ فرشتوں کو دیکھتے تھے، ان سے گفتگو کرتے تھے اور ان کی باتوں کو سنتے تھے۔یہاں تک کہ جبرئیل امینؑ آپؐ پر نازل ہوئے اور کہا: "اقرَأ"[2]۔یہاں سے آپؐ پر وحی کا آغاز ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی یہ بےمثال مخلوق اور انسانِ کامل، نزولِ وحی سے پہلے ہی کمال کے اِس مرحلے پر پہنچ چکے تھے۔ آپؐ نے اپنی بعثت کے آغاز ہی سے ایک کثیر الجہتی جہاد کا آغاز فرمایا اور اپنی زندگی کے باقی تیئس (۲۳) سالوں میں انتہائی مشکلات کے ساتھ اِس جہاد کو آگے بڑھایا۔ آپؐ کا جہاد اپنے نفس اور ان لوگوں کے خلاف تھا جو حقیقت سے بالکل

۱۔ بحار الانوار، ج۱۷، ص۳۰۹

۲۔ پڑھو۔ (سورہ علق، آیت۱)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

بے خبر تھے اور آپؐ کا جہاد اس (وحشت زدہ اور) تاریک ماحول کے خلاف تھا کہ جس کے بارے میں امیر المومنین امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں: ''فِي فِتَنٍ دَاسَتْهُمْ بِأَخْفَافِهَا وَ وَطِئَتْهُمْ بِأَظْلَافِهَا وَ قَامَتْ عَلَى سَنَابِكِهَا''[1] ہر طرف سے فتنوں نے لوگوں کو دبا کر رکھا تھا، دنیا طلبی، شہوت رانی، ظلم و دست درازی اور دیگر اخلاقی برائیاں انسانوں کے وجود میں رچ بس چکی تھیں، طاقتور لوگوں کے ہاتھ بغیر کسی روک ٹوک کے کمزوروں کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ استحصال اور ظلم و ستم کا یہ ماحول صرف مکہ مکرمہ یا جزیرۃ العرب تک محدود نہ تھا، بلکہ اُس دور کی تہذیب و تمدن کے دو بڑے گہوارے، یعنی روم اور ایران کا بھی یہی حال تھا۔ آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھئے کہ پورے عالمِ بشریت پر ظلم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت کے آغاز، یعنی نزولِ وحی کی ابتداء سے ہی اِن بڑی طاقتوں کے خلاف ناقابلِ تصوّر حدّ تک مسلسل جدّ و جہد کرتے رہے، دوسری طرف وحیِ الٰہی بھی مسلسل ایک ایسے چشمے کی مانند جو کسی ہموار زمین پر جاری ہو، آپؐ کے قلبِ مبارک پر نازل ہو رہی تھی اور آپؐ کو توانائی فراہم کر رہی تھی۔ چنانچہ آپؐ بھی اس دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کرنے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

اُمتِ مسلمہ کے جسم کے ابتدائی خلیوں کی بنیاد خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکی دور کے اِن مشکل ایام میں اپنے مضبوط دستِ مبارک سے رکھی تھی، اس عمارت کے وہ مضبوط اور مستحکم ستون کہ جن پر اس عظیم الشان عمارت کو قائم ہونا تھا، آپؐ کی دعوت پر سب سے پہلے ایمان لانے والے وہ مومنین تھے، جن کے اندر اتنی عقل، بہادری اور نورانیت پائی جاتی تھی کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس پیغام کو سمجھیں اور اس کو اپنے دلوں میں جگہ دیں۔

۱۔ یہ لوگ ایسے فتنوں میں مبتلا تھے جنہوں نے انہیں اپنے پیروں تلے روند دیا تھا اور اپنے محکم سُموں سے کچل دیا تھا اور خود اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے تھے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ نمبر۲)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

’’فَمَنۡ يُرِدِ اللّٰهُ أَنۡ يَهۡدِيَهُ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهُ لِلۡإِسۡلَام‘‘[1]

پیغمبر اسلامؐ کے قدرت مند ہاتھوں سے ان الٰہی معارف و الٰہی احکامات و تعلیمات کی طرف لوگوں کے دل مائل ہوئے اور ان کے دلوں کے دروازے اور ذہنوں کے دریچے کھل گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ ارادے مضبوط اور مستحکم تر ہوتے چلے گئے۔

مکی دور میں مومنین کی اس قلیل تعداد (جس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا) نے جن مشکلات اور تکالیف کا سامنا کیا، ہم ان کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں کے تمام امتیازات اور خصوصیات جاہلانہ رسوم و رواج پر مشتمل تھیں، جہاں بے جا تعصّبات، کینہ و حسد، بے جا غیرتمندی، اندھی دشمنیاں، سنگدلیاں، بدبختیاں، ظلم و جور، شہوانی خواہشات اور دیگر برائیوں نے لوگوں کی زندگیوں کو جکڑ رکھا تھا۔ پھر یکایک اِس خاردار اور پتھریلی زمین پر ایسے سرسبز (اور پھلدار) پودے اُگنے لگے کہ جس کے بارے میں حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں: ’’وَإِنَّ الشَّجَرَةَ الْبَرِّيَّةَ أَصْلَبُ عَوداً وَأَقْوَى وَقُوداً‘‘[2] کوئی بڑے سے بڑا طوفان بھی ان نو نہالوں، ننھے پودوں اور ان درختوں کو جو اس پتھریلی زمین پر اپنی جڑیں مضبوطی سے گاڑ کر رُشد کر چکے تھے، نہیں ہلا سکا۔ اسی طرح تیرہ سال گزر گئے پھر انہیں مضبوط اور توانا ستونوں پر اسلامی، مدنی اور نبویؐ معاشرے کی بنیاد رکھی گئی۔

اسلامی نظام کی بنیاد

اُمت سازی صرف سیاست نہیں، بلکہ سیاست خود اُمت سازی کا ایک حصّہ ہے۔ اُمت سازی جیسا اہم کام ایک ایک فرد کی تعلیم و تربیت سے عبارت ہے: ’’هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الۡأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِّنۡهُمۡ يَتۡلُو عَلَيۡهِمۡ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتَابَ وَ

۱۔ پس خدا جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے۔ (سورہ انعام، آیت ۱۲۵)

۲۔ جنگلی درختوں کی لکڑی سخت اور آگ شعلہ دار ہوتی ہے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ نمبر۴۵)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

الْحِكْمَةَ''[1] ''يُزَكِّيهِمْ'' یعنی پیغمبر اسلامﷺ ایک ایک آدمی کی تربیت کرتے تھے اور ہر ایک کے ذہن و عقل کو علم و دانش کی تلقین فرماتے تھے۔ ''وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ'' حکمت ایک درجہ بالا تر ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ آپؐ لوگوں کو صرف احکام اور قوانین سکھاتے تھے، بلکہ آپؐ انہیں حکمت بھی سکھاتے تھے اور دنیا کے حقائق کے بارے میں ان کی آنکھوں کو کھولتے تھے۔

پیغمبر اسلامﷺ دس سال تک اس طریقہ کار پر عمل کرتے رہے ایک طرف تو سیاسی اور حکومتی اُمور کی دیکھ بھال، اسلامی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت، اسلام کی تبلیغ و ترویج، مدینہ کے باہر سے لوگوں کے اجتماعی اور انفرادی طور پر اسلام کی نورانی تعلیمات سے بہرہ ور ہونے کی راہ ہموار کرنا اور دوسری طرف ان میں سے ایک ایک فرد کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا۔ ان تمام کاموں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ لوگ اسلام کو ایک انفرادی مسئلہ قرار دیتے ہوئے سیاست کو اسلام سے الگ سمجھتے ہیں، جبکہ نبی اکرمﷺ نے ہجرت کے آغاز پر یعنی مکہ کی دشوارترین زندگی سے چھٹکارا پاتے ہی جو پہلا کام انجام دیا، وہ سیاست ہی تھا۔

ایک اسلامی معاشرے کا وجود، اسلامی نظامِ حکومت کا قیام، افواجِ اسلامی کا قیام اور دنیا کے بڑے بڑے سیاستدانوں (اور حکمرانوں) کے نام خطوط لکھنا، اس دور کے عظیم سیاسی اُمور ہی تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سیاست کو اسلام سے الگ کیا جائے؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ سیاست کو اسلام کے نظامِ ہدایت کے علاوہ کسی اور نظام کے حوالے کیا جائے؟

''الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ''[2]

''جن لوگوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔''

۱۔ وہ (خدا) جس نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا جو انہیں میں سے تھا، وہ اُن پر آیات کی تلاوت کرتا تھا، ان کے نفوس کو پاکیزہ بناتا تھااور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا تھا۔ (سورہ جمعہ، آیت ۲)

۲۔ سورہ حجر، آیت ۹۱

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

''يُؤْمِنُ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَيَكْفُرُ بِبَعْضٍ''[1] یعنی قرآن کی عبادی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن اس کی سیاسی تعلیمات پر ایمان نہیں رکھتے۔ ''لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ''[2] یہ قسط کیا ہے؟ قسط یعنی معاشرے میں اجتماعی عدل و انصاف قائم کرنا اور یہ کام کون کر سکتا ہے؟ عدل و انصاف پر مبنی معاشرے کا قیام، ایک سیاسی عمل ہے جو کہ اس ملک کے حکمرانوں اور مسئولین کا کام ہے اور یہی انبیاؑ کا ہدف بھی تھا۔ نہ صرف ہمارے نبی مکرمؐ بلکہ حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ اور دیگر انبیاءؑ کا مقصد اور ہدف، سیاست اور اسلامی نظام کا قیام رہا ہے۔

مدینہ کے دس سالہ دورِ حکومت میں حضور اکرمؐ کی سیرت، پوری تاریخ انسانیت کا درخشاں ترین دور ہے (اور یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے)۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تاریخ بشریت کے اس مختصر مگر متحرک اور حیران کن حدّ تک مؤثر دور کو سمجھا جائے۔ مدنی زندگی کا یہ دس سالہ دور آپؐ کی تئیس (۲۳) سالہ مدتِ رسالت کا دوسرا حصہ ہے، جبکہ تیرہ سالہ مکی دور آپؐ کے دورانِ رسالت کا پہلا حصہ یا اس دوسرے حصے کے لیے تمہید کی حیثیت رکھتا تھا۔

حضور اکرمؐ کی مدنی زندگی کا دس سالہ دور، جو اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے نیز ہر زمانے اور ہر جگہ بسنے والے انسانوں کے سامنے اسلامی حاکمیت کا ایک رول ماڈل پیش کرنے کا دور ہے، یہ ایک ایسا کامل نمونہ اور رول ماڈل ہے کہ اس کی دنیا میں کہیں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن اس کامل نمونے کو دیکھ کر کچھ خصوصیات کی پہچان حاصل کی جاسکتی ہے اور وہ خصوصیات انسانوں اور مسلمانوں کے لیے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور انہیں خصوصیات کو دیکھ کر کسی بھی نظام اور انسان کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت کا مقصد اُس فاسد اور ظالمانہ نظام کے خلاف نبرد آزما ہونا

۱۔ قرآن کی بعض آیتوں پر تو ایمان لے آئے اور بعض کو قبول نہ کرے۔ (تحف العقول، ص۴۸۵)

۲۔ بیشک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔ (سورہ حدید، آیت ۲۵)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

تھاجو اُس دور کے سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی میدانوں میں مستحکم تھا۔ آپؐ کا مقصد صرف کفار مکہ سے نمٹنا ہی نہیں تھا بلکہ یہ ایک عالمی مسئلہ تھا۔ آپؐ کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ جہاں کہیں بھی زمین ہموار نظر آتی وہاں اس اُمید کے ساتھ اسلامی عقیدے کا بیج بوتے تھے کہ وقت آنے پر یہ بیج ایک سرسبز پودے کی شکل اختیار کر لے گا۔

آپؐ کا ہدف یہ تھا کہ آزادی، بیداری اور انسانی خوش بختی کا یہ پیغام ہر شخص تک پہنچ جائے اور (ظاہر ہے کہ) یہ کام ایک رول ماڈل نظام کو وجود میں لائے بغیر ممکن نہ تھا، لہٰذا آپؐ مدینہ تشریف لائے تاکہ ایک رول ماڈل نظام وجود میں لا سکیں اور یہ کہ اس نظام کو کب تک چلایا جا سکتا ہے یا بعد میں آنے والے لوگ کس حد تک خود کو اس نظام سے وابستہ رکھ سکتے ہیں، وہ انہیں پر منحصر ہے۔ نبی مکرمﷺ کا کام تو ایک مثال قائم کرنا اور اسے تمام انسانوں اور تاریخ کے سامنے پیش کرنا ہے۔

نظام مصطفویﷺ کی اہم خصوصیات

پیغمبر اسلامﷺ نے جو نظام قائم کیا، وہ کئی خصوصیات کا حامل تھا مگر ان میں سے ذیل کی سات خصوصیات زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

پہلی خصوصیت؛ ایمان اور معنویت ہے۔ یعنی نبی اکرمﷺ کے قائم کردہ نظام میں ایمان اور معنویت کو ایک ایسے محرک اور مشین کی حیثیت حاصل ہے جو حقیقت میں اِس نظام کو آگے بڑھانے والا ہے، جو لوگوں کے دل و ذہن کے سرچشمے سے پھوٹتا ہے اور انسان کے ہاتھ پیر اور دیگر اعضاء و جوارح کو صحیح راستے پر قائم رکھتا ہے۔ پس نبویؐ نظام کی پہلی خصوصیت لوگوں میں ایمان اور معنویت کی روح پھونکنا اور ان کے عقائد کو استحکام بخشنا ہے۔ پیغمبر اکرمﷺ نے اس کام کا آغاز مکہ سے کیا اور مدینہ میں اس کے پرچم اقتدار کو پوری طاقت کے ساتھ بلند کیا۔

دوسری خصوصیت؛ عدل و انصاف ہے۔ یعنی نبی اکرمﷺ کے قائم کردہ نظام میں قوانین کے نفاذ کا حقیقی معیار عدل و انصاف اور کسی کا لحاظ کیے بغیر، حق کو اس کے حقدار

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

تک پہنچانا ہے۔

تیسری خصوصیت؛ علم اور معرفت ہے۔ نبویؐ نظام میں ہر چیز کی بنیاد علم و معرفت اور آگہی و بیداری پر قائم ہے۔ یہاں آنکھیں بند کر کے آگے بڑھنے کی بالکل بھی گنجائش نہیں۔ لہٰذا یہاں پر لوگوں کو علم ومعرفت کے ذریعہ قوتِ فیصلہ عطا کرتے ہوئے انہیں ایک کار آمد کارکن بنایا جاتا ہے، نہ کہ انہیں ایک بے مقصد اور ناکارہ آدمی بنایا جاتا ہے۔

چوتھی خصوصیت؛ اخوت اور بھائی چارگی ہے۔ نبویؐ نظام میں خرافات، ذاتی مفادات اور نفسانی خواہشات کی بنیاد پر ہونے والے جھگڑوں کو بُرا سمجھا جاتا ہے اور ان کے خلاف جہاد کیا جاتا ہے کیونکہ یہاں اخوت، بھائی چارگی اور ہمدردی کا ماحول پایا جاتا ہے۔

پانچویں خصوصیت؛ اخلاق اور کردار کی اصلاح ہے۔ جس کے ذریعے یہ نظام ہر قسم کی اخلاقی برائیوں سے انسان کو پاک و صاف کرتا ہے اور اسے تمام آلودگیوں سے نجات دیتا ہے اور اسے ایک بااخلاق اور پاک و پاکیزہ انسان بناتا ہے: ''وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ''[1] یہاں تزکیۂ نفس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بہترین طریقۂ تربیت کے ذریعے آدمی کو انسان بناتے تھے۔

چھٹی خصوصیت؛ عزت اور اقتدار ہے۔ نبویؐ نظام اور اسلامی معاشرہ کسی سے وابستہ نہیں ہوتا اور نہ ہی غیروں کے سامنے دستِ سوال پھیلاتا ہے، اسے اپنی عزت اور اپنے اقتدار سے بڑا پیار ہے، وہ اپنی مصلحتوں کی تعیین خود کرتا ہے اور پھر اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے شاہراہِ نجات پر گامزن ہو جاتا ہے۔

ساتویں خصوصیت؛ کام، کوشش اور مسلسل جدّ و جہد ہے۔ اسلامی معاشرے اور نبویؐ نظام میں ٹھہراؤ اور جمود کا کوئی تصوّر نہیں ہے، بلکہ یہاں تو مسلسل جدّ و جہد، کوشش اور کام کا رواج ہے۔ یہاں ایسا مرحلہ ہی نہیں آتا جہاں ٹھہر کر انسان یہ کہہ سکے کہ کام ختم ہوگیا اب تو بس آرام کیا جائے! البتہ اس کام اور جدّ و جہد میں ایک

۱۔ انہیں پاک و پاکیزہ بناتے ہیں اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ (سورہ آل عمران، آیت ۱۶۴)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

لذت اور خوشی پائی جاتی ہے۔ اِس کام میں تھکن، سستی اور ملال کا گزر بھی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسا کام ہے جو انسان کے اندر ایک سرور اور شوق پیدا کرتا ہے۔

پیغمبر اکرمﷺ ایک ایسے نظام کو مکمل طور پر عملی جامہ پہنا کر ہمیشہ کے لیے بطورِ نمونہ تاریخ کے پیشِ نظر رکھنے کے ارادے سے مدینہ میں داخل ہوئے، تاکہ آپؐ کے بعد رہتی دنیا تک تاریخ کا کوئی بھی شخص کبھی بھی اور کہیں بھی اس طرح کا نظام وجود میں لا سکے اور لوگوں کے دلوں کو اس جانب متوجہ کر سکے تاکہ لوگ ایک اچھے معاشرے کی جانب بڑھ سکیں۔ البتہ ایک ایسے نظام کو وجود میں لانے کے لیے درج ذیل مضبوط اعتقادی اور انسانی بنیادوں کی ضرورت ہے۔

اول: سب سے پہلے صحیح عقائد اور فکرِ سلیم کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان صحیح افکار پر اِس نظام کی بنیاد رکھی جا سکے۔ پیغمبر اسلامﷺ نے تیرہ سالہ مکی دور میں ان عقائد اور افکار کو کلمۂ توحید، انسانی عزت اور دیگر اسلامی معارف کے قالب میں بیان فرمایا اور اس کے بعد مدینہ منورہ میں اپنی زندگی کے آخری لحات تک، ایک ایک مسلمان کو ان عقائد اور افکار کی تعلیم دیتے رہے، جنھیں اِس نظام میں بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

دوم: انسانی بنیادوں اور ستونوں کی کہ جن کے دوش پر اِس عظیم الشان عمارت کی بنیاد رکھنی تھی، لازمی ضرورت تھی کیونکہ اسلامی نظام کا وجود کسی ایک فرد سے وابستہ نہیں ہے، لہٰذا پیغمبر اسلامﷺ مکہ مکرمہ میں بہت سارے ایسے انسانی ستون وجود میں لائے اور انہیں تیار کیا۔ (مکہ مکرمہ میں) پیغمبر اسلامﷺ کے عظیم صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد (جن کے مقام و مرتبے میں فرق ضرور تھا) موجود تھی، جو پیغمبر اسلامﷺ کے تیرہ سالہ سخت ترین مکی دور کی جدّ و جہد اور کوششوں کا نتیجہ تھی۔ کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو ہجرتِ رسول اکرمﷺ سے پہلے ہی آپؐ کا پیغام سن کر یثرب میں ایمان لا چکے تھے۔ جیسے سعد ابن معاذ اور ابو ایوب انصاری اور دوسرے بہت سارے افراد۔ اس کے بعد مدینہ تشریف لاتے ہی پیغمبر اسلامﷺ نے لوگوں کی تربیت کا فریضہ انجام دینا شروع کیا، جس کے نتیجے میں دن بہ دن شائستہ، شجاع، مدبّر، مومن، بامعرفت اور حکیم افراد مدینہ میں ظاہر ہوتے گئے جہاں ہر ایک کا کردار اِس بلند و بالا عمارت میں ایک اہم

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

اور مستحکم ستون کی حیثیت رکھتا تھا۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی مدینہ ہجرت

پیغمبر اسلام ﷺ کا مدینہ ہجرت کرنا (آپؐ کے ہجرت کرنے سے پہلے اِس شہر کو یثرب کہا جاتا تھا اور آپؐ کے تشریف لانے کے بعد اس کا نام "مدینۃ النبیؐ" پڑ گیا) ایسا ہی تھا جیسے موسمِ بہار کی ہوا کا ملائم جھونکا جس نے اس پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور سب کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ یقیناً کوئی تبدیلی آچکی ہے۔ لہٰذا لوگوں کے دل و دماغ متوجہ اور بیدار ہونے لگے اور جب لوگوں کو اس بات کا پتہ چلا کہ آپؐ "قُبا" کے مقام پر تشریف لا چکے ہیں (قُبا مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے جہاں آپؐ نے پندرہ دن قیام کیا) تو اہلِ مدینہ کے دلوں میں آپؐ کی زیارت کا اشتیاق بڑھنے لگا، بعض لوگ آپؐ کے دیدار کی خاطر قُبا گئے اور پیغمبر ﷺ کی زیارت کرنے کے بعد مدینہ لوٹ آئے اور بعض مدینہ ہی میں آپؐ کا انتظار کرنے لگے اور جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو اس شوقِ زیارت نے لوگوں کے دلوں میں ایک طوفان برپا کردیا اور انہیں تبدیل کرکے رکھ دیا۔ لوگوں کو یکایک یہ احساس ہونے لگا کہ اِس عظیم شخصیت کی رفتار اور گفتار کی وجہ سے ان کے عقائد، احساسات، قبائلی تعصّبات اور ان سے وابستگیاں ختم ہو چکی ہیں اور وہ ایک جدید دروازے سے حقائقِ عالم اور اخلاقی معارف سے روشناس ہو چکے ہیں۔ یہ وہ طوفان تھا کہ جس نے پہلے تو (مدینہ کے) لوگوں کے دلوں میں انقلاب پیدا کر دیا اور بعد میں مدینہ کے اطراف میں بھی پھیلنے لگا پھر اس نے مکہ کے قلعوں کو تسخیر کر دیااور آخر کار دور دراز کے علاقوں میں بھی قدم رکھنا شروع کر دیا،یہاں تک کہ اُس دور کی دو عظیم طاقتوں کے مرکز تک پہنچ گیا اور جہاں بھی گیا اِس انقلاب نے لوگوں کے دل ہلا دیئے اور ان کے وجود میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

صدرِ اول کے مسلمانوں نے ایران اور روم کو اپنے ایمان کی طاقت سے فتح کیا اور جن علاقوں کو فتح کیا وہاں کے لوگوں کے دل بھی مسلمانوں کو دیکھ کر ایمان کے نور سے منوّر ہو جاتے تھے۔ تلواریں تو صرف اس لیے تھیں کہ ان کے ذریعے راستے کی رکاوٹوں اور

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

دولت و طاقت کے نشے میں چور حکمرانوں کو ہٹایا جائے، ورنہ لوگوں کی اکثریت نے ہر جگہ اس انقلابی پیغام کو قبول کر لیا تھا اور اس دور کے دو سپر طاقتیں، یعنی ایران اور روم مکمل طور پر اسلامی نظام اور اسلامی مملکت کا حصّہ بن چکی تھیں۔ یہ سب کچھ چالیس سال کے عرصے میں ہو چکا تھا، جن میں سے شروع کے دس برسوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ نفسِ نفیس موجود تھے، جبکہ باقی تیس برس کا تعلق آپؐ کی وفات کے بعد سے ہے۔

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ پہنچتے ہی اپنے کام کا آغاز فرمایا۔ آپؐ کی زندگی کا ایک حیرت انگیز شاہکار یہ بھی ہے کہ آپؐ نے اِن دس برسوں میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ آپؐ نے کبھی بھی معنویت و ہدایت اور تعلیم و تربیت کی نور افشانی میں ذرّہ برابر تامل سے کام نہیں لیا۔ آپؐ کا سونا جاگنا، کوچہ و بازار میں آنا جانا، عبادت و بندگی، گھریلو زندگی اور آپؐ کے وجودِ مبارک سے متعلق ہر شئی ایک درس کا عنوان رکھتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ میں عجیب برکت پائی جاتی ہے! ایسی بابرکت زندگی جس نے پوری تاریخ کو اپنی طرف متوجہ کیے رکھا اور پوری تاریخ پر اثر انداز رہی۔ میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ مساوات و برابری، اخوت و برادری، عدل و انصاف اور انسان دوستی جیسی بہت سی مقدّس تعلیمات، جن کے تقدّس کو انسان صدیوں بعد سمجھ پایا ہے، ان کا تقدّس آئینِ محمدیؐ کے صدقے میں برقرار ہوا ہے۔

دوسرے ادیان کی تعلیمات میں یاتو ایسی اعلیٰ صفات کا وجود ہی نہیں تھا یا کم از کم انہیں ظہور و عروج نہیں ملا تھا۔ آپؐ نے یہ سارے کام اپنی دس سالہ حکومت کے دوران انجام دیئے تھے۔ آپؐ کی زندگی کتنی بابرکت تھی! آپؐ نے مدینہ پہنچتے ہی اپنی پوزیشن کو واضح کر دیا تھا۔ جس اونٹنی پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوار تھے جب وہ مدینہ میں داخل ہوئی تو لوگ اس کے اردگرد جمع ہوگئے۔ اس دور میں مدینہ مختلف محلوں میں تقسیم تھا اور ہر محلے میں متعدد گھرانے اور گلی کوچے تھے اور ہر محلہ کسی نہ کسی قبیلے سے متعلق تھا، جس میں کچھ بزرگ ہستیاں بھی تھیں۔ لوگوں میں کسی کا تعلق قبیلہ ''اوس'' سے تو کسی کا قبیلہ ''خزرج'' سے تھا۔ جب آپؐ کی اونٹنی یثرب میں داخل ہوئی تو جس قبیلے اور محلّے سے گزرتی تھی اس قبیلے کے بزرگ آگے بڑھ کر اونٹنی کی مہار تھام کر کہتے تھے: اے

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

اللہ کے رسول ﷺ! یہیں ٹھہر جائیے۔ ہمارا گھر، ہماری زندگی، ہماری دولت و ثروت سب آپؐ پر نثار۔

حضور ﷺ فرماتے تھے: اُونٹنی کے سامنے سے ہٹ جائیے: "إِنَّهَا مَأْمُورَةٌ" کیونکہ یہ حکم کے مطابق چل رہی ہے۔ لہٰذا اسے جانے دیجئے۔ لوگ اُونٹنی کے سامنے سے ہٹ جاتے اور وہ دوسرے محلے پہنچ جاتی تو یہاں بھی قبیلے کے سردار، بزرگ، بوڑھے اور جوان آگے بڑھ کر آپؐ کی اونٹنی کی مہار تھام کر کہتے: اے اللہ کے رسول ﷺ! یہیں پر اُتر جائیے یہ آپؐ ہی کا گھر ہے آپؐ جو چاہیں آپؐ کو فراہم کیا جائے گا۔ ہم سب آپؐ کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ آپؐ پھر فرماتے: راستے سے ہٹ جائیے اور اُونٹنی کو آگے بڑھنے دیجئے؛ "إِنَّهَا مَأْمُورَةٌ" اسی طرح آپؐ کی اونٹنی مختلف گلیوں اور محلوں سے ہوتی ہوئی بنی نجار کے محلے تک پہنچ گئی، حضور اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ (جناب آمنہ علیہا) کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا، جس کی وجہ سے قبیلہ بنی نجار کا شمار آپؐ کے ننھیال میں ہوتا تھا۔ لہٰذا اس قبیلے کے لوگوں نے آگے بڑھ کر کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم آپؐ کے رشتہ دار ہیں، ہماری جانیں آپؐ پر قربان ہوں۔ آپؐ ہمارے ہاں اُتر جائیے، آپؐ نے فرمایا: نہیں "إِنَّهَا مَأْمُورَةٌ" سامنے سے ہٹ جائیے اور راستہ دیجئے، سواری حکم کی پابند ہے۔ یہاں تک کہ اونٹنی چلتے چلتے مدینہ کے غریب محلے میں جاکر بیٹھ گئی۔ سب دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ کس کا گھر ہے! لوگوں نے دیکھا کہ یہ ابو ایوب انصاری کا گھر ہے، یعنی مدینہ کے غریب اور نادار لوگوں میں سے ایک شخص کا گھر ہے۔ ابو ایوب انصاری اور ان کے اہلِ خانہ باہر آئے اور حضورؐ کا سامان اُٹھایا اور اندر لے گئے۔ نبی رحمت ﷺ بھی ایک مہمان کی حیثیت سے ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ حضور اکرم ﷺ نے مدینہ کے قبائل کے سرداروں اور رئیسوں کی دعوت مسترد کرتے ہوئے اپنی اجتماعی پوزیشن کو واضح کردیا اور سب سمجھ گئے کہ سرورِ کائنات ﷺ کا معیارِ معاشرت مال و منال، جاہ و جلال، قوم و قبیلہ، رشتہ داری وغیرہ نہ اب ہے اور نہ ہی آئندہ کبھی ہوگا۔ آپؐ نے پہلے مرحلے میں ہی یہ واضح کردیا کہ اجتماعی معاملات میں لوگوں سے آپؐ کا سلوک کس بنیاد پر استوار ہوگا اور آپؐ معاشرے کے کس طبقے کے حامی و طرفدار ہوں گے اور آپؐ کا

۱۔ بحار الانوار، ج۱۹، ص۱۰۹

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

وجود کس طبقے کے لیے زیادہ مفید ہو گا۔ سب نبی کریمﷺ کے وجودِ پُرنور اور آپؐ کی تعلیمات سے بہرہ مند ہوں گے، مگر جو طبقہ معاشرے میں محروم و مظلوم تھا وہ اب زیادہ آپؐ کی رحمت (اور توجہ) کا حقدار ہو گا تاکہ اس کی محرومیوں اور مظلومیت کی تلافی ہو سکے۔

ابو ایوب انصاری کے گھر کے سامنے بیکار زمین کا ایک ٹکڑا تھا۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ یہ زمین کس کی ہے؟ کہا گیا کہ یہ زمین دو یتیم بچوں کی ملکیت ہے۔ آپؐ نے اپنی جیب سے رقم دے کر وہ زمین خرید لی اور فرمایا: یہاں مسجد تعمیر ہو گی۔ مسجد یعنی اسلام کی عبادی، اجتماعی، حکومتی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز؛ یعنی لوگوں کے اجتماع اور اکٹھے ہونے کی جگہ۔ اسلامی معاشرے کو ایسے مرکز کی ضرورت تھی لہٰذا مسجد کی تعمیر شروع ہوگئی۔ آپؐ نے مسجد کی زمین کے لیے کسی سے درخواست نہیں کی، کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا، بلکہ خود اپنی رقم خرچ کی۔ اگرچہ ان دو بچوں کے سر پر باپ کا سایہ نہ تھا اور ان کا کوئی دوسرا حمایتی اور طرفدار بھی نہ تھا، مگر سرورِ کائناتﷺ نے ایک مہربان باپ اور شفیق سرپرست کا کردار ادا کرتے ہوئے ان کے حق کا مکمل لحاظ رکھا۔

پھر جب مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو سب سے پہلے خود پیغمبرِ رحمتﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے زمین کی کھدائی شروع کی۔ صرف اعزازی اور نمائشی طور پر نہیں، بلکہ حقیقی معنوں میں محنت کی اور پسینہ بہایا۔ آپؐ تعمیراتی کاموں میں اس طرح مصروف تھے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے لوگ بھی یہ کہتے ہوئے تعمیر کے کاموں میں مشغول ہو گئے کہ نبی اکرمﷺ کام کریں اور ہم بیٹھے رہیں؟! اس لیے سب کی انتھک محنتوں کے نتیجے میں مسجد کی تعمیر بہت جلد مکمل ہوگئی۔ نبی اکرمﷺ جیسی عظیم اور قدرت مند ہستی نے اپنے عمل سے یہ واضح کر دیا کہ اگرچہ قوم کی رہبری میرے اختیار میں ہے مگر اس کا مقصد سلطنت و حکمرانی نہیں ہے، اگر یہ طے ہو کہ معاشرے میں کوئی کام انجام پائے تو اس میں ضروری ہے کہ اس قوم کا رہبر بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنا خون پسینہ بہائے۔

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

اس کے بعد آپؐ نے سیاسی معاملات اور حکومتی اُمور سے متعلق اپنے منصوبے کا آغاز فرمایا، جب انسان ان تمام چیزوں کا بغور مطالعہ کرتا ہے تو بخوبی سمجھتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی قوی عزم اور مضبوط سوچ کار فرما ہے، جو علی الظاہر وحیِ الٰہی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آج اگر کوئی شخص ان دس برسوں کا قدم بہ قدم مطالعہ کرنا چاہے تو وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا اور اگر انسان ایک ایک واقعے کا الگ سے جائزہ لے تو بھی کچھ نہیں سمجھ پاتا ہے۔ لٰہذا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کام کی ترتیب کیا ہے اور کس طرح یہ سارے اُمور بہترین طریقے اور ہوشیاری کے ساتھ منظّم اور صحیح طور پر انجام پائے ہیں۔

پہلا کام اتحاد کی فضاء کو ایجاد کرنا تھا کیونکہ مدینہ میں بسنے والے تمام لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان کی اکثریت نے اسلام قبول کیا تھا لیکن کچھ لوگ اب بھی غیر مسلم تھے۔ ان کے علاوہ بھی مدینہ میں تین اہم یہودی قبائل، یعنی بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ رہائش پذیر تھے اور ہر قبیلے کا ایک خاص قلعہ تھا؛ یعنی یہ قبیلے اپنے مخصوص قلعوں میں، جو تقریباً مدینہ سے جڑے ہوئے تھے زندگی گزارتے تھے۔ یہ قبائل کوئی سو دو سو سال پہلے مدینہ میں آکر آباد ہوئے تھے، لیکن یہ لوگ یہاں آکر کیوں آباد ہوئے تھے؟ یہ خود ایک تفصیلی بحث ہے۔ جب سرورِ کائنات ﷺ مدینہ میں وارد ہوئے اس وقت مدینہ میں ان یہودیوں کو چند امتیازات حاصل تھے۔

پہلا امتیاز یہ تھا کہ مدینہ کی اصل دولت و ثروت، بہترین کھیت، بہترین تجارت، یعنی سونا چاندی اور جواہرات کی صنعتیں وغیرہ ان یہودیوں کے اختیار میں تھیں۔ مدینہ کے اکثر لوگ بوقت ضرورت اِن کے دست نگر ہوا کرتے تھے، ان سے قرض لیتے اور پھر سُود کے ساتھ اسے واپس کرتے تھے، یعنی مدینہ کی اقتصادیات پر یہودیوں کا قبضہ تھا۔

دوسرا یہ کہ تہذیب و ثقافت اور مدنیت کے لحاظ سے بھی یہودی، مدینہ کی دیگر قوموں پر برتری رکھتے تھے۔ ظاہر ہے اہل کتاب ہونے کی بنیاد پر وہ مختلف علوم اور دینی تعلیمات سے آشنائی رکھتے تھے، لٰہذا فکری لحاظ سے وہ دوسروں پر تسلط رکھتے تھے۔ اگر آج کی اصطلاح میں کہاجائے تو یہ لوگ اُس زمانہ کا ''روشن خیال'' طبقہ کہلاتے

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

تھے؛ لہٰذا دوسرے افراد کو احمق، بےوقوف اور حقیر جانتے تھے اور اگر کہیں کوئی خطرہ محسوس کرتے تو وہاں دب بھی جاتے تھے، لیکن طبیعی طور پر اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے۔

تیسرا امتیاز ان کا یہ تھا کہ دور دراز کے علاقوں سے بھی تعلقات رکھتے تھے، لہٰذا یہ ایک ایسی قوم نہیں تھی جو صرف مدینہ کے اندر محدود ہو۔ مدینہ کے یہودیوں کے ان امتیازات اور ان کی اِس حیثیت کے پیشِ نظر رسول اکرمﷺ کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے تعلقات کی حدود و شرائط کا تعیُّن کریں، جب آپؐ مدینہ میں داخل ہوئے تو بغیر کسی معاہدے اور لوگوں سے کسی بھی قسم کا کوئی تقاضا کیے بغیر، یہ واضح ہوگیا کہ اس معاشرے کی قیادت آپؐ کے پاس ہے، یعنی آپؐ کی شخصیت اور نبوی عظمت نے طبیعی طور پر تمام لوگوں کو آپؐ کے مقابلے میں سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا اور سب پر یہ بات عیاں ہو گئی کہ محمدؐ عربی ایک ایسے رہبر اور قائد ہیں کہ جو کہتے ہیں سب کو اس پر عمل کرنا ہوتا ہے، لہٰذا آپؐ نے ایک ایسا میثاقِ عام اور عہد نامہ سامنے رکھا جو سب کے لیے قابلِ قبول تھا۔ اِس میثاق میں اجتماعی رہن سہن، لین دین کے معاملات، اختلافات، دیت اور مخالفین، یعنی یہودیوں اور دیگر غیر مسلموں کے ساتھ حضور اکرمﷺ کے تعلقات وغیرہ جیسے مسائل سے متعلق شرائط اور قواعد درج تھے۔ یہ سب مفصّل طور پر تاریخ کی قدیمی کتابوں میں موجود ہے۔

اس کے بعد اگلا انتہائی اہم قدم، اخوت اور بھائی چارگی کا قیام تھا۔ طبقاتی نظام، بے جا تعصُّبات، قبائلی غرور اور معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان دشمنی اور نفرت، اس دور کے متعصّب اور جاہل معاشرے کے لیے کسی بلا سے کم نہ تھی، لیکن پیغمبر اسلامﷺ نے لوگوں کے درمیان اخوت اور بھائی چارگی کا رشتہ قائم کرکے ان تمام مسائل کو اپنے پیروں تلے کچل دیا۔ آپؐ نے ایک قبیلے کے سردار کو ایک انتہائی غریب اور متوسط طبقے کے شخص کا بھائی بناتے ہوئے فرمایا: ”آج سے تم دونوں آپس میں بھائی ہو۔“ اور انہوں نے بھی بھائی چارگی کے اس رشتے کو خوشی خوشی قبول کر لیا۔

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

خاندان کے بزرگوں، قبائل کے سرداروں اور آزاد شدہ مسلم غلاموں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ آپؐ کے اِس عمل نے اجتماعی اتحاد و ہمدردی کی راہ میں موجود تمام رکاوٹوں کو ختم کر دیا۔ جب مسجد کے لیے ایک مؤذّن کے انتخاب کی باری آئی تو آپؐ نے تمام رئیسوں، امیروں، خوش الحانوں اور خوبصورت شکل افراد کو چھوڑ کر بلال حبشی کو بطورِ مؤذّن معین کیا۔ آپؐ نے اپنے اس طریقۂ انتخاب کے ذریعے واضح کر دیا کہ یہاں محض ظاہری خوبصورتی، خوش الحانی، خاندانی امتیازات اور قبائلی شرف کی کوئی حیثیت نہیں ہے، بلکہ یہاں معیار صرف اسلام و ایمان، راہِ خدا میں جہاد اور ایثار و فداکاری جیسے اعلیٰ اخلاقی فضائل ہیں۔

غور کیجیۓ کہ سرور کائناتﷺ نے کس طرح عملی طور پر انسانی اقدار کو سربلندی عطا کی۔ آپؐ نے اپنے قول سے زیادہ اپنے عمل، سیرت اور کردار کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو متاثر کیا ہے۔

اسلامی نظام کی دشمنوں سے حفاظت

اس کام کو عملی جامہ پہنانے کے تین مراحل تھے۔ پہلا مرحلہ اِس نظام کی بنیاد رکھنا تھا جو مذکورہ کاموں کے ذریعے انجام پایا۔ دوسرا مرحلہ اس نظام کی حفاظت کا تھا۔ ایک زندہ اور موجود چیز جو رشد و کمال کی طرف بڑھ رہی ہو اگر طاقتور حلقوں کو پتہ چلے تو طبیعی طور پر اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں اور یقیناً اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اب اگر پیغمبر اسلامﷺ کمالِ ہوشیاری کے ساتھ اِس نوزائدہ نظام کو اس کے دشمنوں سے بچانے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو یہ نظام تباہ و برباد ہو سکتا ہے اور آپؐ کی تمام زحمتیں رائیگاں جا سکتی ہیں، اس لیے اِس نظام کی حفاظت ضروری تھی۔ تیسرا مرحلہ اس عمارت کی تعمیر ہے۔ صرف بنیاد رکھنا کافی نہیں، بلکہ یہ پہلا قدم ہے لہٰذا اِن تینوں مرحلوں کو بالترتیب انجام دینا ضروری تھا۔

البتہ اِس نظام کے پہلے مرحلے یعنی بنیاد رکھتے ہوئے بھی دشمن سے بچ کے رہنے اور اس کے بعد اس کی حفاظت بھی ضروری تھی۔ اسی طرح اس نظام کی بنیاد ہی میں لوگ

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

اور ان کے اجتماعی مسائل پر بھرپور توجہ دی گئی ہے اور اس کے بعد بھی ان پر خاصی توجہ دی جاتی رہی۔ پیغمبر اکرمﷺ نے اپنی تیزبین نگاہوں سے دیکھا کہ اس نوزائندہ اسلامی معاشرے کو پانچ اصلی دشمنوں کی طرف سے خطرات لاحق ہیں۔

پہلا دشمن ارد گرد کے قبائل تھے۔ بعض اوقات دشمن چھوٹا اور بے اہمیت ہوتا ہے مگر اس سے غفلت برتنا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ ممکن ہے یہی چھوٹا دشمن کچھ مدت کے بعد بڑے دشمن کی شکل اختیار کر لے۔ یہ دشمن کون ہے؟ یہ اطراف مدینہ کے کچھ ایسے قبائل تھے جنہیں وحشی کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ ان کی پوری زندگی جنگ و خونریزی، قتل و غارتگری اور ایک دوسرے کے خلاف کاروائیوں سے عبارت تھی۔

مدینہ میں قابلِ اطمینان اجتماعی نظم و ضبط کے باوجود، امن کی خاطر حضور اکرمﷺ کے لیے ضروری تھا کہ اِن قبائل کے حوالے سے کوئی فیصلہ کریں، لہٰذا آپؐ نے ہر اُس قبیلے سے امن وسلامتی کا معاہدہ کیا جس میں ذرہ برابر بھی مروت و مردانگی پائی جاتی تھی۔ ابتدا میں انہیں اسلام کی طرف دعوت نہیں دی، بلکہ انہیں اپنے کفر و شرک پر باقی رہنے دیا اور معاہدہ صرف امن کی بحالی کے لیے کیا۔

آپؐ اپنے اس معاہدے کے پابند رہے لیکن جب ان لوگوں نے ہی معاہدہ توڑ دیا تو سرورِ کائناتﷺ نے بھی انہیں سبق سکھانے کی تدبیر کی۔ تاریخ اسلام کے متعدد سریوں[1] کا تعلق انہیں معاہدہ شکن شریر اور غیر قابلِ اعتماد قبائل سے ہے۔ جن لوگوں کو نصیحت کی زبان راس نہیں آتی، ان کے فتنوں کی آگ کو صرف زورِ بازو سے ہی خاموش کیا جا سکتا ہے۔ اس اصول کے تحت نبی اکرمﷺ نے طاقت استعمال کر کے ان کی گستاخیوں اور امن مخالف سرگرمیوں کا خاتمہ کیا اور انہیں خاموش بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

دوسرا دشمن مکہ مکرمہ میں موجود مشرکین تھے، مکہ کو مرکزیت حاصل تھی۔ اگرچہ یہاں پر قانونی طور پر کسی ایک کی حکومت نہیں تھی، مگر کچھ متکبر، طاقتور اور بااثر

۱۔ "سریہ" اس لشکر کو کہتے ہیں جس کے سپاہیوں کی تعداد ۴۰۰ سے کم ہو اور اصطلاح میں یہ لفظ "غزوہ" کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے، یعنی سریہ اس جنگ کو کہا جاتا ہے جس میں حضور اکرمﷺ بہ نفس نفیس شریک نہ ہوئے ہوں۔

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

سرداروں کے ایک گروہ کی داداگیری ضرور چلتی تھی۔ ان کے آپس میں خلفشار اور اختلافات تو تھے لیکن اس جدید اور نئے دین کے مقابلے میں ان کا اتحاد مثالی تھا۔ پیغمبر خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ والوں کو ایک بڑے خطرے کی شکل میں دیکھ رہے تھے اور عملاً بھی ایسا ہی ہوا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ اس انتظار میں رہیں کہ یہ لوگ خود آپؐ کے پیچھے چلے آئیں گے تو یقیناً دشمن کو ایک بہترین موقع مل جائے گا، لہٰذا آپؐ خود ہی ان کے پیچھے چلے گئے، البتہ آپؐ سیدھے مکہ کی طرف نہیں گئے بلکہ ان کا ایک تجارتی قافلہ جو مدینے کے قریب سے گزر رہا تھا اسے آپؐ کے حکم سے روک لیا گیا۔ جنگ بدر کی ابتداء اسی سے ہوئی جب آپؐ نے تجارتی قافلے کو روکا تو وہ بھی تعصُّب اور کینہ کے مارے آپؐ کے خلاف جنگ کے لیے میدان میں اُتر آئے۔

(۲۰۰۱/۰۵/۱۸ء)

اللہ تعالٰی کے وعدے کے مطابق مسلمانوں کو پہلے ہی یہ خبر ملی تھی کہ وہ کافروں کے اس گروہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں گے اور یہ ہجرت کے دوسرے سال کا واقعہ ہے کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ اپنا تجارتی سامان لے کر مدینہ کے راستے شام سے مکہ جارہا تھا جب یہ قافلہ مدینہ کے قریب پہنچا تو مسلمان سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔ جب کفار مکہ کو اس بات کی اطلاع ملی تو ان کا ایک مسلح گروہ اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔

ادھر اکثر مسلمانوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ اس تجارتی قافلے کو جن کے پاس اپنے دفاع کا کوئی خاص انتظام نہ تھا گرفتار کریں، لیکن حکمِ خدا یہ تھا کہ مسلمان قریش کے مسلح گروہ سے مقابلہ کریں:

''وَ إِذْ یَعِدُکُمُ اللهُ إِحْدَی الطَّائِفَتَیْنِ أَنَّهَا لَکُمْ وَ تَوَدُّونَ أَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَةِ تَکُونُ لَکُمْ''[1]

۱۔ اور اس وقت کو یاد کرو جب خدا تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک تمہارے لیے بہر حال ہے اور تم چاہتے تھے کہ تمہارے لیے وہ غیر مسلح (تجارتی) گروہ ہو۔ (سورہ انفال، آیت ۷)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

مسلمان اِس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ اِس جنگ میں وہ کامیاب ہونے والے ہیں لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اس مسلح گروہ کو شکست دینے والے ہیں، بلکہ وہ شام سے لوٹنے والے اِس قافلے کو گرفتار کرنے کو ہی اپنی کامیابی سمجھتے تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا راستہ تبدیل کیا اور آپؐ انہیں قریشِ مکہ کے مسلح گروہ سے مقابلہ کے لیے لے گئے اور ان کے تجارتی قافلے کو جانے دیا۔ "بدر" نامی جگہ پر مسلمانوں اور قریشِ مکہ کے درمیان مقابلہ ہوا۔

اب اس کی کیا وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے رُخ کو تجارتی قافلے کی طرف سے موڑ کر قریشِ مکہ کے اس مسلح گروہ کی طرف کر دیا؟ اِس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان صرف قریب کے ہدف کو دیکھتے تھے جبکہ ارادہ اور مشیتِ الٰہی ایک دور کے ہدف کے تعاقب میں تھی۔

"وَيُرِيدُ اللهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ"[۱] یعنی اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ پوری کائنات میں حق چھا جائے۔ "لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ"[۲] یعنی اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ باطل مٹ جائے کیونکہ وہ طبیعتاً زوال پذیر ہی ہوتا ہے۔ باطل ایک ساتھ اُلٹ جائے۔ کیا یہ طے نہیں ہے کہ اسلام تمام شیطانی اور طاغوتی طاقتوں کو سرنگوں کر دے؟ کیا یہ طے نہیں کہ ملتِ اسلامیہ "لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ"[۳] کا مصداق بن جائے؟ کیا یہ طے نہیں کہ اسلام کا پرچم، بشری اور انسانی اقدار کی بلندی پر لہرایا جائے؟ تو پھر یہ کب، کیسے اور کیونکر ہو گا؟

اُس وقت کے مسلمان دل ہی دل میں یہ سوچ رہے تھے اگر آج ہم اس دولت مند قافلے کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے تو اتنا مال ہمارے ہاتھ لگ جائے گا کہ جس سے اسلام کے نئے نظام کو ایک نئی قوت ملے گی اور ان کی یہ سوچ صحیح بھی تھی لیکن ان کی اس سوچ سے بہتر ایک سوچ یہ بھی تھی کہ آج ہم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور

۱۔ اللہ اپنے کلمات کے ذریعہ حق کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ (سورہ انفال، آیت۷)

۲۔ تاکہ حق ثابت ہو جائے اور باطل فنا ہو جائے چاہے مجرموں کو جتنا بھی برا لگے۔ (سورہ انفال، آیت۸)

۳۔ تاکہ تم دوسرے لوگوں کے اعمال پر گواہ بن جاؤ۔ (سورہ بقرہ، آیت۱۴۳)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

پیروی میں اس قدر ترقی کی ہے اور ہم اتنے آگے بڑھ چکے ہیں کہ اب ہم معاشرے کے مستضعف اور محروم طبقے اور دنیا کے تاریک و ظالم نظام کو بدلنے کا سوچ رہے ہیں۔

کیونکہ اس تالاب میں اتنا پانی موجود ہے کہ اس میں لہریں پیدا کی جاسکیں اور ان لہروں کے ذریعے ان نونہالوں، درختوں اور خشک زمینوں کو سیراب کیا جا سکے۔ اگر یہ طے ہے کہ اسلام کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہو، اگر یہ طے ہے کہ اسلام کا پیغام اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ غریب اور مستضعف علاقوں کی طرف پھیل جائے، اگر یہ طے ہے کہ ظالموں اور ستمگروں کے محل ایک ایک ہو کر زمین بوس ہو جائیں، تو ضروری ہے کہ کسی ایک نکتے سے کام کا آغاز کیا جائے۔ صدرِ اول کے مسلمان اپنے تمام تر اخلاص کے باوجود یہ نہیں جانتے تھے کہ آغاز کہاں سے ہو؛ لٰہذا اللہ تعالیٰ اس موقع پر ان کی راہنمائی فرماتا ہے۔ وہ مسلمان جو اس قافلے کو لوٹنے آئے تھے انہیں با دلِ نخواستہ ایک جنگ کی طرف دھکیلتا ہے تاکہ اس ناخواستہ جنگ میں جنگی وسائل کی کمی کے باوجود، اپنے ایمان کے بل بوتے پر ایک ہی دن میں دشمن کو شکست دے سکیں اور اسلام کے پیغام کو آگے بڑھنے اور لوگوں میں اس کو راسخ کرنے کا راستہ ہموار کر سکیں اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا راستہ ہموار کرکے لوگوں کو یہ سمجھا سکیں کہ یہ اسلام ہے، اس کا کسی سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ ''لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ'' اے مسلمانوں ہم نے تمہیں اچانک اس بڑے لشکر کے ساتھ جنگ کا حکم دیا تاکہ وہ تمہارے ہاتھوں زخموں کا مزہ چکھ لیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا احساس ہو جائے۔

(۰۳/۱۰/۱۹۸۰ء)

جنگ بدر میں جب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجاہدینِ اسلام کو کامیابی ملی تو دشمن نے جو آسانی کے ساتھ دستبردار ہونے والا نہ تھا، جنگِ اُحد کا فیصلہ کر لیا۔جنگ اُحد میں بھی شروع میں تو مسلمانوں نے اپنے اتحاد اور اتفاق کے بل بوتے پر دشمن کو شکست دی، لیکن کامیابی حاصل کرنے کے فوراً بعد وہ پچاس مسلمان، جنہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہاڑی درّے کی پہرہ داری پر مقرّر کیا تھا اس بات کے پیشِ نظر کہ کہیں وہ مالِ غنیمت جمع کرنے میں دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائیں، اپنی ذمہ داری چھوڑ کر مالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے۔ صرف دس مسلمان سپاہی پہاڑی درّے پر بیٹھ کر اپنی ذمہ داریاں

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

ادا کرتے رہے۔ دشمن نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کوہِ اُحد کے پیچھے اور اس درّے کی جانب سے جہاں مسلمان سپاہیوں کی تعداد بہت کم تھی، مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ دشمن کا یہ حملہ مسلمانوں کے لیے بہت ہی خطرناک ثابت ہوا، اگرچہ اس وقت بھی اسلام کو شکست نہیں ہوئی، لیکن ایک تو اسلام کو کامیابی دیر سے ملی اور دوسری بات یہ کہ اس غفلت کے نتیجے میں اسلام کو سید الشہداء حضرت حمزہؑ جیسے شجاع اور بہادر کمانڈر کی قربانی دینی پڑی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عبرت کے ساتھ ساتھ غور و فکر کی بھی دعوت دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے اپنے وعدے پر عمل کیا، ہم نے کہا تھا کہ تمھیں دشمن پر کامیابی حاصل ہوگی سو ہوگئی، لیکن اس کے بعد تمہارے اندر درج ذیل تین خصلتیں پیدا ہو گئیں، جن کی وجہ سے تمہیں نقصان اُٹھانا پڑا۔ وہ تین خصلتیں یہ ہیں: پہلی یہ کہ ''تَنَازَعۡتُمۡ فِي ٱلۡأَمۡرِ'' تم نے آپس میں اختلافات کا شکار ہوتے ہوئے اپنی صفوں کو درہم برہم کر دیا، دوسری یہ کہ ''فَشِلۡتُمۡ'' تم سستی کا شکار ہوگئے، یعنی پہلے والا جوش و جذبہ باقی نہیں رہا اور تیسری یہ کہ ''عَصَيۡتُمۡ''[۱] یعنی تم نے پیغمبر اسلام ﷺ اور اپنے کمانڈروں کے حکم کو ٹھکرایا اور ان کے دستورات پر عمل نہیں کیا۔ پس جب تمہارے اندر یہ تین خصلتیں پیدا ہوئیں تو دشمن کو یہ موقع ملا کہ وہ پیچھے سے تم پر حملہ کر سکے اور اسلام کے عزیز ترین سپاہیوں کو خاک و خوں میں غلطاں کرے، جس کے نتیجے میں ملتِ اسلامیہ کو ایک شجاع اور بہادر شخص سے ہاتھ دھونا پڑا۔

(۱۹/۰۵/۱۹۸۰ء)

مشرکینِ مکہ نے آپؐ سے جو آخری جنگ کی، وہ جنگ خندق تھی۔ (جس کا شمار انتہائی اہم جنگوں میں ہوتا ہے) مشرکینِ مکہ نے اپنی اس شرمناک سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہودیوں اور دیگر بہت سارے بت پرست قبائل کی مدد حاصل کی۔ وہ چاہتے تھے کہ مدینہ منورہ پر ایک بڑا اور فیصلہ کن حملہ کرکے اسلام کی اس تازہ حکومت کا خاتمہ کر دیں اور رسول خدا ﷺ اور ان کے دو چار سو وفادار اور جانثاروں کو شہید کرکے اسلام کا نام و نشان مٹا دیں، لیکن ان کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی جب حضور اکرم ﷺ کو اس سازش کا پتہ چلا تو آپؐ نے خندق کھدوائی۔ جس جگہ سے مدینے پر حملے کا خطرہ تھا وہاں پر تقریباً چالیس میٹر چوڑی خندق کھودی گئی۔

۱۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۵۲

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

رمضان المبارک کا مہینہ تھا بعض روایات کے مطابق سخت سردی کا موسم تھا اس سال بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے محصولات کی بھی خاصی کمی ہوگئی تھی، لہٰذا بے شمار مشکلات کا سامنا تھا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ خود حضور اکرمﷺ بنفسِ نفیس خندق کھودنے میں مصروف تھے۔ جب خندق کی کھدائی کا کام شروع ہوا تو آپؐ وہاں موجود تھے اور دیکھتے تھے کہ جب بھی ان میں سے کوئی تھک جاتا یا کام صحیح طریقے سے انجام نہیں دے پاتا، تو آپؐ آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے اوزار لے لیتے اور خود کام کرنا شروع کر دیتے تھے، یعنی آپؐ صرف حکم نہیں چلاتے تھے بلکہ بنفسِ نفیس لوگوں کے درمیان موجود ہوتے تھے اور کام کرتے تھے۔ مشرکینِ مکہ نے جب مدینے کے اطراف میں کھدی ہوئی خندق کو دیکھا اور انہیں یہ احساس ہوا کہ وہ خندق پار نہیں کر سکتے ہیں تو مایوس ہوکر واپس لوٹ گئے۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا: مشرکینِ مکہ کا ہم پر یہ آخری حملہ تھا آج کے بعد وہ ہم پر حملہ نہیں کر سکیں گے بلکہ اب ہماری باری ہے ہم مکہ مکرمہ جاکر ان پر حملہ کریں گے۔

اس سے اگلے سال پیغمبر اسلامﷺ نے فرمایا کہ ہم عمرہ ادا کرنے مکہ مکرمہ جانا چاہتے ہیں۔ صلحِ حدیبیہ کا واقعہ، جو تاریخ اسلام کا بڑا پُر مغز اور پُر معنی واقعہ ہے، اس کا تعلق بھی اسی زمانے سے ہے۔ آنحضرتؐ عمرے کے قصد سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مشرکین نے دیکھا کہ حضور اکرمﷺ ایسے مہینہ میں مکہ کی طرف آرہے ہیں جو قابلِ احترام ہے کہ جس میں جنگ نہیں کی جا سکتی، کیونکہ مشرکین بھی اِن مہینوں کا احترام کرتے تھے۔ لہٰذا سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے؟ آپؐ کو آنے دیا جائے یا روک دیں؟ اگر آنے دیتے ہیں تو پھر مقابلہ کی کیا صورت ہو؟ کیا ماہِ حرام میں بھی جنگ کی جائے؟ کس طرح جنگ کی جائے؟ اس طرح کے ڈھیروں سوال ان کے ذہنوں میں اُٹھ رہے تھے۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت محمدﷺ کو مکہ مکرمہ میں داخلے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور موقع ملتے ہی مسلمانوں کا قتلِ عام کر دیا جائے گا۔

لیکن رسول خداﷺ کی اعلیٰ تدبیر کے نتیجے میں یہی کفارِ مکہ آنحضرتؐ کے ساتھ معاہدہ کرنے پر مجبور ہوئے، جس کے مطابق یہ طے پایا کہ آپؐ آئندہ سال مکہ میں

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

عمرہ بجا لاسکتے ہیں۔ یہ معاہدہ آپؐ کے دائرہ تبلیغ کی مزید وسعت کا سبب بنا۔ دنیا اسے ’’صلح‘‘ کے نام سے جانتی ہے، لیکن خداوند کریم نے اسے ’’فتح‘‘ کا عنوان دیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے: ’’إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحاً مُّبِيْناً‘‘[۱] ’’بےشک ہم نے آپؐ کو کھلی فتح عطا کی ہے۔‘‘ اگر صحیح اور مستند تاریخ کی طرف رجوع کیا جائے تو صلحِ حدیبیہ کے حوالے سے بڑے حیرت انگیز حقائق سامنے آئیں گے۔ صلح کے دوسرے سال حضور اکرمؐ عمرے کی ادائیگی کے لیے تشریف لے گئے اور دشمنانِ اسلام کی مخالفتوں کے باوجود آپؐ کی شان و شوکت میں مزید اضافہ ہوتا رہا۔

اِس سے اگلے برس یعنی ہجرت کے آٹھویں سال جب کفارِ مکہ نے معاہدہ توڑا تو سرور کائناتؐ نے مکہ فتح کر لیا۔ ایسی عظیم فتح ملی جو آپؐ کے اقتدار کا مکمل اظہار تھی۔ پورے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے قدرت و تدبیر، صبر و حوصلے، عزم و استقلال اور ثبات و استحکام کے ذریعے اپنے دشمن کو سر اُٹھانے کو موقع بھی نہ دیا اور آپؐ اپنے الٰہی اغراض و مقاصد کی راہ میں روز افزوں ترقی کے مراحل طے کرتے رہے۔

مدینہ منوّرہ کے یہودیوں کے ساتھ آپؐ کا برتاؤ

تیسرے دشمن، یہودی تھے۔ یہ ایسے ناقابلِ اطمینان لوگ تھے جنھوں نے وقتی طور پر مسلمانوں کے ساتھ مدینہ میں ہی مل جل کر رہنے کا عہد کیا تھا مگر پھر بھی ایذاء رسانی، خلل اندازی اور تخریب کاری سے باز نہیں آتے تھے۔ سورۂ بقرہ کا ایک اہم حصّہ اور بعض دیگر سورتیں یہودیوں کے ساتھ آنحضرتؐ کی ثقافتی جنگ کے بیان پر مشتمل ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ مدینہ منورہ کے یہودی خود ایک تہذیب و ثقافت کے حامل تھے، آگاہ و ہوشیار تھے، کمزور عقیدے کے حامل افراد کے دل و دماغ کو متاثر کر دیتے تھے، سازشیں کرتے، لوگوں کو نااُمید اور مایوس کرتے تھے اور لوگوں کو ایک دوسرے کی جان کا دشمن بنا دیتے تھے۔ یہ یہودی آنحضرتؐ کے ایسے دشمن تھے جن کی دشمنی منظّم

۱۔ سورہ فتح، آیت ۱

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

اور منصوبہ بندی پر استوار تھی۔

پیغمبر اکرمؐ نے ان کے ساتھ حتی المقدور نرمی برتی، لیکن جب پانی سر سے اُونچا ہوا تو انہیں کیفر کردار تک پہنچادیا۔ آپؐ نے بغیر کسی وجہ کے یکدم انہیں سزا نہیں دی، بلکہ ان تینوں یہودی قبیلوں میں سے ہر ایک نے معاہدے کی شدید خلاف ورزی کی، تو اپنے کیے کا نتیجہ بھی انہیں بھگتنا پڑا۔

سب سے پہلے جب بنی قینقاع نے حضور اکرمؐ سے خیانت کی، تو آپؐ نے اُن سے فرمایا: ''اب تمہیں مدینہ چھوڑنا ہوگا۔'' وہ مدینے سے نکال دیئے گئے اور ان کی جائیداد وغیرہ مسلمانوں کے حصّے میں آئی۔

دوسرا قبیلہ بنی نضیر تھا، جس نے معاہدے کو توڑا (ان کی خیانت کی داستان بڑی اہم ہے) ان کو بھی رسول اکرمؐ نے اپنے کچھ اموال کے ساتھ مدینہ چھوڑنے کا حکم دیا لہٰذا وہ بھی مجبور ہو کر چلے گئے۔

تیسرا قبیلہ، بنی قریظہ کا تھا جنہیں حضورؐ نے امان دیتے ہوئے مدینہ میں رہنے کی اجازت دی۔ انہیں مدینہ سے نہیں نکالا، بلکہ ان سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ جنگِ خندق میں اپنے محلوں سے دشمن کو مدینہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، لیکن انہوں نے احسان فراموشی کا ثبوت دیتے ہوئے سرورکائناتؐ پر حملہ کے لیے دشمن سے معاہدہ کر لیا اور آپؐ سے کیے گئے معاہدے پر باقی نہ رہے۔ مدینہ کے ایک حصّہ میں رسول اکرمؐ نے مدینہ کی حفاظت کے لیے خندق کھدوائی تھی اور دوسری جانب اِن یہودیوں کا محلہ تھا جہاں سے دشمن کو روکنا ان کے ذمے لگایا تھا، لیکن ان خیانت کاروں نے معاہدے پر عمل کے بجائے، پیٹھ پر خنجر مارنا چاہا اور دشمن کے ساتھ مل کر سازش کر لی کہ ایک ساتھ مدینہ میں داخل ہو کر مسلمانوں پر حملہ کریں گے۔ مگر ان کی یہ سازش مخفی نہ رہ پائی۔ اس سازش کے آشکار ہونے تک مدینہ کے محاصرہ کو تقریباً ایک مہینہ گزرچکا تھا۔

رسول اکرمؐ نے ان کی اس ناپاک سازش کا مقابلہ اپنی حکیمانہ تدبیر سے کیا، جس کی بنیاد پر خود قریش اور ان یہودیوں کا ایک دوسرے سے اعتماد اُٹھ گیا اور ان کی ساری

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

ساز شیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ یہ پورا ماجرا تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبردست جنگی تدبیر اور سیاسی فراست کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ آپؐ نے انہیں یہیں روکے رکھا تاکہ کوئی نقصان نہ پہنچائیں، جب قریش اور ان کے حلیفوں کو شکستِ فاش ہوگئی اور وہ خندق کے آس پاس سے مکہ کی طرف واپس پلٹ گئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ کے اندر مسجد میں نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد فرمایا کہ نمازِ عصر بنی قریظہ کے قلعوں کے سامنے پڑھی جائے گی، سب مسلمان وہاں چلیں۔ ایک شب کا بھی وقفہ کیے بغیر آپؐ نے مسلمانانِ مدینہ کے ہمراہ بنی قریظہ کو محاصرہ میں لے لیا۔ پچیس دن تک محاصرہ اور مقابلہ جاری رہا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ان کے سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا کیونکہ ان کی خیانتیں آشکار تھیں اور قابلِ اصلاح نہ تھیں۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ یہ رویّہ اختیار کیا اور اسلام و مسلمین کے سر سے بنی قریظہ، بنی نضیر اور خیبر کے یہودیوں کی دشمنی کا آسیب اعلیٰ انسانی اخلاق کے ساتھ، قدرت، حکمت اور تدبیر کے ذریعے دور کر دیا۔ اِن تمام واقعات میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی ایک مقام پر بھی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ دشمن بھی اس بات کے معترف ہیں کہ معاہدہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں بلکہ خود یہودیوں نے توڑا تھا۔

چوتھے دشمن، منافقین تھے۔ یہ لوگ عوام کے درمیان رہتے تھے، زبانی طور پر تو ایمان کا اقرار کیا کرتے تھے مگر ان کے دل ایمان سے خالی تھے۔ یہ انتہائی پست، کینہ پرور، تنگ نظر اور دشمن کا ساتھ دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہنے والے افراد تھے۔ یہودیوں اور منافقوں میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ منافقین کی اسلام دشمنی منصوبہ بندی کے ساتھ نہیں تھی۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حملہ کی تاک میں رہنے والے منصوبہ ساز دشمن کو امان نہیں دیتے تھے اور اس کے ساتھ وہ رویّہ اختیار کرتے تھے جو آپؐ نے یہودیوں کے ساتھ اختیار کیا، لیکن جو دشمن منصوبہ بندی نہیں کرتے تھے اور جن کی بے ایمانی، خباثت اور ہٹ دھرمی انفرادی تھی، نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں برداشت کر لیا کرتے تھے۔

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

عبد اللہ ابن اُبَی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ تقریباً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری سال تک زندہ رہا، لیکن آپؐ نے اس کے ساتھ سخت رویّہ اختیار نہیں کیا۔ سب مسلمان جانتے تھے کہ وہ منافق ہے، اِس کے باوجود آپؐ نے اس کے ساتھ دیگر مسلمانوں جیسا ہی سلوک روا رکھا، ہمیشہ بیت المال سے اس کے حقوق ادا کیے اور اس کی جان و مال کو محفوظ رکھا جبکہ اس جیسے منافقین اپنی خباثتوں سے باز نہیں آتے تھے اور سورۂ بقرہ کا ایک حصّہ انہیں کی مذمت میں نازل ہوا ہے۔

جب بھی منافقین کے کسی گروہ نے منصوبہ بندی کے ساتھ تحریک شروع کی، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کا مقابلہ کیا۔ ایک مرتبہ ان لوگوں نے منافقانہ سازشوں کے لیے ضرار نامی مسجد کو مرکز بنایا۔ اسلامی حکومت سے باہر روم کے قلمرو میں موجود ابو عامر راہب جیسے شخص سے رابطہ برقرار کیا تاکہ رومیوں کے ذریعہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لشکر کشی کی جائے۔ اس منصوبہ بندی کے ساتھ کی جانے والی دشمنی کا مقابلہ کرنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجدِ ضرار منہدم کرا دی اور فرمایا کہ یہ عمارت مسجد نہیں، بلکہ یہ اللہ اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا گڑھ ہے۔

اسی طرح منافقین کے ایک گروہ نے اپنے کفر کا اظہار کرتے ہوئے مدینہ منورہ سے باہر ایک لشکر تیار کر لیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا مقابلہ کیا اور فرمایا کہ اگر وہ نزدیک آئیں گے تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے گی۔ خود مدینہ منورہ میں بھی منافقین موجود تھے لیکن اللہ کے رسولؐ نے منصوبہ ساز دشمنوں کی طرح ان کے ساتھ سلوک نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے آپؐ نے منصوبہ ساز منافقین کے مقابلے میں سخت رویّہ اختیار کیا، لیکن دیگر منافقین کے ساتھ نرم سلوک روا رکھا کیونکہ ان کا خطرہ انفرادی تھا۔ اکثر و بیشتر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نیک سلوک کے ذریعہ انہیں شرمندہ ہونے پر مجبور کر دیتے تھے۔

پانچواں دشمن وہ تھا، جو ہر مسلمان اور مومن کے باطن میں موجود تھا اور یہی دشمن سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ دشمن ہمارے اندر بھی موجود ہے۔ نفسانی خواہشات، خود غرضی، ضلالت و گمراہی کی طرف رجحان اور ایسی لغزشیں جن کا سبب خود انسان فراہم کرتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دشمن کا بھی زبردست مقابلہ کیا۔ اس دشمن سے

Presented by: https://jafrilibrary.com/

مقابلے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس مقابلے میں شمشیر اور تیر و تبر سے کام نہیں لیا جاتا، بلکہ تعلیم و تربیت، تزکیہ نفس اور خوفِ الٰہی کے اسلحوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ مسلمان لشکر سخت جنگ کر کے لوٹا تو سرور کائناتﷺ نے فرمایا: ''مرحبا ہو تم پر کہ تم لوگوں نے جہادِ اصغر تو سر کر لیا اور اب جہادِ اکبر باقی رہ گیا ہے۔'' سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس سے بڑا کونسا جہاد ہو سکتا ہے؟ لہٰذا پوچھا: یا رسول اللہﷺ! جہادِ اکبر کیا ہے؟ ہم نے اتنی سخت جنگ لڑی، بڑی زحمتیں اُٹھائیں، صعوبتیں جھیلیں، مصیبتیں برداشت کیں، اب اس سے بڑھ کر جہاد کیا ہو سکتا ہے؟! آپؐ نے فرمایا: ''وہ ہے نفس کے ساتھ جہاد''[1] جب قرآن میں ارشادِ الٰہی ہوتا ہے: ''اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ''[2] تو اِس آیت میں جن کے دلوں میں مرض بتایا گیا ہے وہ سب کے سب منافق نہیں ہیں، بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہے کہ منافقین بھی اس آیت کے مصداق ہیں، یعنی عین ممکن ہے کہ ایک شخص منافق نہیں، بلکہ مومن ہے مگر اس کے دل میں ''مرض'' پایا جاتا ہو۔ یہ کون سا مرض ہے؟ یہ کیسی بیماری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اخلاق اور کردار کی کمزوریاں، نفسانی خواہشیں اور مختلف قسم کی خود غرضیاں ہیں کہ اگر ان سے پرہیز نہ کیا گیا اور ان کا مقابلہ نہ کیا گیا تو انسان ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ظاہر تو مومنوں جیسا ہوگا لیکن دل ایمان سے خالی ہوگا اور اسی کو اسلام کی اصطلاح میں ''منافق'' کہا جاتا ہے۔

اگر خدانخواستہ ہمارا اور آپ کا دل ایمان سے خالی ہو جائے، جبکہ ظاہری شکل و شمائل مومنوں جیسے ہوں، اگر ہم کردارِ ایمانی اور اعتقادی حدود سے تجاوز کر جائیں، جبکہ ہماری زبانیں حسبِ سابق مومنوں جیسی باتیں کر رہی ہوں، تو یہی نفاق ہے۔ یہ ایک اسلامی معاشرے کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ قرآن کریم میں اِس سلسلے میں ارشادِ الٰہی ہوتا ہے:

۱۔ ''مَرْحَباً بِقَوْمٍ قَضَوُا الْجِهَادَ الْأَصْغَرَ وَ بَقِىَ عَلَيْهِمُ الْجِهَادُ الْأَكْبَرُ قِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ! وَ مَا الْجِهَادُ الْأَكْبَرُ؟ قَالَ: جِهَادُ النَّفْسِ'' (وسائل الشیعہ، ج۱۱، ص۱۱۲)

۲۔ سورہ توبہ، آیت ۱۲۵

Presented by: https://jafrilibrary.com/
Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

”ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاۗؤُوا السُّوَآى أَن كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِؤُونَ“[1]

اس کے بعد بُرائی کرنے والوں کا انجام بُرا ہو۔ وہ بُرا کیا ہے؟ وہ خدا کی نشانیوں کا جھٹلانا ہے۔ ایک اور مقام پر ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے اس عظیم فریضے (اللہ کی راہ میں خرچ) پر عمل نہیں کیا، ارشاد ہوتا ہے:

”فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقاً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُواْ اللهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُواْ يَكْذِبُونَ“[2]

جن لوگوں نے اس عظیم ذمہ داری (راہِ خدا میں انفاق) پر عمل نہیں کیا، انہوں نے خدا کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے اس لیے ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا۔ اسلامی معاشرے کے لیے یہ ایک انتہائی خطرناک چیز ہے۔ آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھیں، اسلامی معاشرے میں جو انحراف پیدا ہوا اس کی وجہ نفاق ہے۔ ممکن ہے کہ ایک مرتبہ باہر سے کوئی دشمن حملہ آور ہو جائے اور وہ شکست دے، مار دھاڑ کر دے لیکن وہ نابود نہیں کر سکتا، کیونکہ ایمان اپنی جگہ باقی رہتا ہے اور کسی نہ کسی موقع پر سر اُبھار لیتا ہے اور دوبارہ ایمان کا شجر سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کبھی یہ اندرونی دشمن حملہ آور ہو جائے تو وہ انسان کے دل کو ایمان کے نور سے خالی کر دیتا ہے اور اسے غلط راستے پر ڈال دیتا ہے۔ پس جہاں کہیں بھی انحراف دکھائی دے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے پیچھے نفاق کار فرما ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں اس دشمن کا بھی مقابلہ کیا ہے۔

۱۔ پھر اس کے بعد برائی کرنے والوں کا انجام برا ہی ہوا کہ انہوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا اور وہ مسلسل خدا کی نشانیوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ (سورہ روم، آیت ۱۰)

۲۔ تو (ان کے بخل نے) ان کے دلوں میں نفاق راسخ کر دیا اس دن تک کے لئے جب وہ خدا سے ملاقات کریں گے اس وجہ سے کہ انہوں نے خدا سے کئے ہوئے اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کی اور وہ مسلسل جھوٹ بولتے رہے۔ (سورہ توبہ، آیت ۷۷)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

پیغمبر اکرم ﷺ کی شخصیت کے پہلو

پیغمبر اکرم ﷺ ہمیشہ تدبّر اور غور و فکر کے بعد کوئی کام کرتے تھے اور ہر کام کو بروقت انجام دیتے اور کسی بھی کام کا وقت گزرنے نہیں دیتے تھے۔ انفرادی لحاظ سے آپؐ قناعت پسند اور پاک و پاکیزہ طبیعت کے مالک تھے، آپؐ کی شخصیت میں کسی بھی قسم کی کمزوری کا کوئی پہلو نہیں پایا جاتا تھا۔ آپؐ پاک و صاف اور عصمت کے مالک تھے؛ یہ چیز خود ہی معاشرے پر اثر انداز ہونے کا ایک بہترین سبب ہے۔ عمل زبان سے کہیں زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ آپؐ ہمیشہ صاف صاف بات کیا کرتے تھے اور کبھی دوغلی باتیں نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب کبھی دشمن سے واسطہ پڑتا تھا تو ایسی سیاست سے کام لیتے کہ دشمن آپؐ کی تدبیر سے دھوکہ کھا جاتا تھا۔ چاہے سیاسی اعتبار سے ہو یا دفاعی لحاظ سے۔ آپؐ نے متعدد بار دشمن کو دھوکہ کھانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن مسلمانوں اور عام لوگوں کے ساتھ سیدھی سیدھی بات کرتے تھے کبھی مبہم بات نہیں کرتے تھے اور بوقتِ ضرورت انتہائی نرمی کا بھی بھرپور مظاہرہ کرتے تھے؛ جیسا کہ عبد اللہ ابن اُبَی کے واقعے میں اس کا ذکر ملتا ہے جو کہ ایک تفصیلی واقعہ ہے۔ آپؐ جب کسی کے ساتھ کوئی وعدہ کرتے تو پھر ہرگز وعدہ خلافی نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے دشمنوں اور کفارِ مکہ کے ساتھ بھی جو وعدے کیے انہیں نہیں توڑا، یہی وجہ ہے کہ سب لوگ جانتے تھے کہ اگر اس شخص کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا جائے تو اس پر عمل درآمد ضرور ہو گا۔

دوسری طرف آپؐ نے اپنے پروردگار کے ساتھ راز ونیاز کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہونے دیا۔ بلکہ آپؐ ہر دن اپنے ربّ کے ساتھ اپنے رابطے کو مضبوط اور مستحکم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میدانِ جنگ کے عین وسط میں جب آپؐ اپنے سپاہیوں کو جنگی ہدایات دیتے اور انہیں جنگ کے لیے تیار کر رہے ہوتے تھے اور خود بھی اپنے ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے ہوتے تھے، تو اچانک زانو کے بل زمین پر بیٹھ جاتے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کر چہرۂ اقدس کا رُخ آسمان کی طرف کرکے آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے اپنے پروردگار کے حضور گڑگڑا کر یوں دعا مانگتے تھے: ”اے میرے پروردگار! ہماری مدد فرما، اے میرے اللہ! اپنے دشمنوں کے مقابلے میں ہمیں نصرت

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

و کامیابی عطا فرما۔“

یعنی نہ تو آپؐ کا اپنے پروردگار کے حضور گڑگڑانا اِس بات کا سبب بنتا تھا کہ آپؐ افرادی طاقت کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتے اور نہ یہ افرادی طاقت پروردگار کے حضور گریہ و زاری میں رکاوٹ بنتی تھی، بلکہ بیک وقت آپؐ کی توجہ دونوں اُمور پر مرکوز ہوتی تھی۔ آپؐ کبھی دشمن سے خوفزدہ نہیں ہوتے تھے۔ امیر المومنین امام علیؑ (جو خود بھی بےمثال شجاعت اور بہادری کے عظیم مظہر تھے) فرماتے ہیں کہ دورانِ جنگ جب کبھی کوئی مشکل پیش آتی یا ہم دباؤ کا شکار ہوتے تو آپؐ کے دامن میں پناہ لیتے تھے۔ یعنی جب کوئی کسی مشکل میں پھنس جاتا تو آپؐ ہی کے دامنِ عافیت میں پناہ لیتا تھا۔

حضور اکرمﷺ نے دس سال حکومت کی، ان دس برسوں میں آپؐ نے جو کام انجام دیا، اگر انتہائی تیز ترین کام کرنے والے ایک گروہ کے حوالے کیا جائے تو وہ سو (۱۰۰) سالوں میں بھی اتنا کام نہیں کر سکتا، جتنا کام آپؐ نے اِن دس برسوں کے دوران انجام دیا۔ آج کے دور میں اگر ہم اپنے اُمور کا پیغمبر اکرمﷺ کے کاموں کے ساتھ موازنہ کریں تو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ آپؐ نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ایک ایسی حکومت کی سربراہی، ایک ایسے معاشرے کی تشکیل، یعنی ایک ایسے رول ماڈل کا وجود میں لانا بذات خود آپؐ کے معجزات میں سے ہے۔

دس برسوں تک لوگوں نے شب و روز آپؐ کے ساتھ زندگی گزاری ہے، لوگ آپؐ کے گھر پر جاتے تھے اور آپؐ بھی لوگوں کے گھر تشریف لے جاتے تھے، مسجد میں ساتھ ساتھ ہوتے تھے، راستے میں ایک ساتھ چلتے تھے، ایک ساتھ سفر پر جایا کرتے تھے، ایک ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے، ایک ساتھ بھوک اور پیاس کی تکلیفیں جھیلتے تھے، ایک ساتھ خوشی غمی میں شریک ہوتے تھے، آپؐ لوگوں کے ساتھ مذاق بھی کیا کرتے تھے، لوگوں کے درمیان کھیلوں کے مقابلے رکھواتے تھے اور خود بھی اِن مقابلوں میں شریک ہوتے تھے۔ جن لوگوں نے دس برس تک آپؐ کے ساتھ زندگی گزاری تھی ان کے دلوں میں ہر گزرتے دن کے ساتھ آپؐ کی محبت میں اضافہ اور آپؐ پر ایمان و اعتقاد

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

بڑھتا جاتا تھا۔ فتح مکہ کے دوران جب ابوسفیان حضرت عباس (حضور اکرمؐ کے چچا) کی مدد سے خفیہ طور پر آپؐ کی خدمت میں پہنچا تاکہ امان حاصل کرسکے، تو اُس نے یہ وقت فجر دیکھا کہ آپؐ وضو کر رہے ہیں جبکہ صحابہ کرام آپؐ کے گرد جمع ہیں تاکہ آپؐ کے وضو کے پانی کو گرنے سے پہلے ہاتھوں میں لینے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے سکیں۔ یہ دیکھ کر ابوسفیان نے کہا: میں نے قیصر و کسریٰ جیسے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو دیکھا ہے لیکن کسی کی بھی اتنی عزت میں نے نہیں دیکھی۔ جی ہاں معنوی عزت ہی حقیقی عزت ہوا کرتی ہے۔ ''وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ''[۱] مومنین بھی اگر اسی راہ پر چلیں تو عزت پا سکتے ہیں۔

(۱۸/۰۵/۲۰۰۱ء)

اسلامی نظام کا استحکام

غدیرِ خم کا واقعہ انتہائی اہم اور تاریخ اسلام کا ایک سنہرا باب ہے۔ اِس واقعے کا دو پہلوؤں سے جائزہ لیا جا سکتا ہے، ان میں سے ایک پہلو کا تعلق اہلِ تشیع سے ہے، جبکہ دوسرے پہلو کا تعلق تمام اسلامی فرقوں سے ہے۔ لہٰذا اِس دوسرے پہلو کی روشنی میں تمام مسلمانوں کے دلوں میں اس احساس کا جاگنا ضروری ہے کہ عیدِ غدیر جو اس عظیم واقعے کی یاد دلاتی ہے اِس کا تعلق صرف اہلِ تشیع سے نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اس واقعے کا ایک پہلو اہلِ تشیع سے مخصوص ہے کیونکہ ان (اہلِ تشیع) کے عقیدے کے مطابق اس واقعے میں امیر المومنین امام علی علیہ السلام، حضور اکرمؐ کے توسط سے منصبِ امامت و خلافت پر فائز ہوئے اور اسی روز اور اسی واقعے کے دوران جب لوگوں نے آپؐ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسولؐ! یہ آپؐ کا اعلان ہے یا اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ''[۲] یعنی یہ حکم، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ دونوں کی طرف سے ہے۔ لہٰذا اِس لحاظ سے اہلِ تشیع

۱۔ ساری عزت تو اللہ، اس کے رسولؐ اور صاحبانِ ایمان کے لیے ہے۔ (سورہ منافقون، آیت۸)

۲۔ الاحتجاج علی اہل اللجاج، طبرسی، ج۱، ص۸۲

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

اس واقعے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کی خلافتِ بلافصل پر یہ سب سے بڑی دلیل ہے۔

اس واقعے کے استدلال اور استنباط پر تاریخ اسلام میں اب تک بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لہٰذا جس موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہوں اور ہزاروں مطالب بیان کیے گئے ہوں میں ان میں مزید کسی چیز کا اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اِس واقعے کا دوسرا پہلو جس کی اہمیت کسی بھی لحاظ سے اس کے پہلے پہلو سے کم نہیں ہے بلکہ شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے درمیان ایک مشترک امر ہے، میں اسے قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ سال ۱۰ ہجری کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے آپؐ کے ہمراہ مدینہ منورہ اور جزیرۃ العرب کے دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ حج بیت اللہ کے اِس سفر کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے لے کر سیاسی اُمور، جنگی معاملات، اخلاقی، اعتقادی اور دیگر مسائل سے روشناس کرتے رہے۔ اِس موقعہ پر آپؐ سے منیٰ میں دو خطبے نقل ہوئے ہیں؛ ان میں سے ایک خطبہ آپؐ نے ۱۰ ذی الحجہ (عید الاضحیٰ) یا انہیں دنوں میں دیا؛ جبکہ دوسرا خطبہ ایامِ تشریق[1] کے آخر میں دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں خطبے الگ الگ ہیں اور ایک نہیں ہیں۔ ان دونوں خطبات میں آپؐ نے تقریباً ان تمام اہم مطالب کو بیان فرمایا ہے جن پر مسلمانوں کو توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ ان میں سے زیادہ تر مسائل کا تعلق سیاسی اُمور سے ہے۔یہاں سے انسان بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ عالمِ اسلام میں آج بھی جو لوگ حج کو سیاسی معاملات سے الگ سمجھتے ہوئے اسے صرف نمازوں اور دعاؤں پر مشتمل ایک عام عبادت سمجھتے ہیں، وہ کس قدر اسلامی تعلیمات اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیّبہ سے لاعلم ہیں۔

۱۔ ''شرق'' کا معنی واضح کرنا، مشرق کی طرف توجہ کرنا ہے، ایامِ تشریق ماہ ذی الحجہ کی ۱۱ تا ۱۳ تاریخ کو کہتے ہیں، جسے قرآن مجید نے ''أَيَّامٍ مَعْدُوْدَاتٍ'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۲۰۳)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

حضور اکرم ﷺ نے اپنے ان خطبات میں جن اُمور کی نشاندہی کی ہے وہ فریقین کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے آپؐ نے جہاد کے بارے میں گفتگو فرمائی اور کفار و مشرکین کے ساتھ جہاد کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ جہاد کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک پوری دنیا میں کلمہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' کی آواز نہیں گونج جاتی۔

اِس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور اتفاق کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انہیں آپس میں لڑنے جھگڑنے سے منع فرمایا اور مسلمانوں کی وحدت پر زور دیا۔ آپؐ نے زمانۂ جاہلیت کے امتیازات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ اسلام کی نظر میں ان امتیازات کی کوئی حیثیت نہیں ہے، آپؐ نے فرمایا: ''أَلَا وَكُلُّ مَأْثُرَةٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ'' آگاہ ہو جاؤ! زمانہ جاہلیت کی تمام قدریں (اور امتیازات خیال کی جانے والی چیزیں) آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ یعنی آپؐ نے زمانۂ جاہلیت کے تمام امتیازات اور قدروں کی کلی طور پر نفی فرمائی۔ آپس کے لین دین کے حوالے سے زمانۂ جاہلیت کے جو قوانین مسلمانوں کے درمیان اب تک رائج تھے مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو قرض دیتا تھا تو بعد میں اسے سُود سمیت وصول کرتا تھا، آپؐ نے اس قانون کو ختم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ: ''أَلَا وَكُلُّ رِبًا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ''[1] سب سے پہلے میں جس منافع کو ختم کر رہا ہوں، سب سے پہلے میں جس سُود کے حکم کو نسخ کر رہا ہوں وہ میرے چچا عباس کا دیا ہوا سُودی قرضہ ہے (کیونکہ وہ زمانۂ جاہلیت میں سُودی قرضہ دیتے تھے اور بہت سے لوگوں سے اس کے طلبگار تھے)۔ آپؐ نے فرمایا: آج میں نے اسے ختم اور نسخ کر دیا ہے۔

آپؐ نے اسلام کی نظر میں تقویٰ کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ایک بار پھر ارشاد فرمایا کہ سوائے تقویٰ اور پرہیزگاری کے کسی شخص کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ ائمۃ المسلمین یعنی مسلمانوں کے پیشواؤں اور راہنماؤں کی دینی اور سیاسی مسائل میں دلچسپی اور ان کی اصلاح کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے، اسے ایک واجب

ا۔ آگاہ ہو جاؤ! زمانۂ جاہلیت کا ہر قسم کا سُود آج میرے قدموں تلے ہے۔ (سیرۃ النبویہ، ج۲، ص۴۱۲)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

عمل قرار دیا اور یہ اعلان فرمایا کہ یہ تمام مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی مملکت کے حکمرانوں کو اپنے نیک مشوروں سے آگاہ کرتے رہیں۔

آپؐ نے اِن خطبات میں عالمِ اسلام کو درپیش اہم سیاسی اور اجتماعی مسائل بیان کیے اور انہیں میں سے ایک حدیث ''ثقلین'' بھی ہے۔ جس میں آپؐ نے فرمایا: میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ''کِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِي'' وہ گراں قدر چیزیں اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) اور میری عترت (یعنی میرے اہل بیتؑ) ہیں۔ یہ کہتے ہوئے آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیوں کو آپس میں نزدیک کرتے اور ملاتے ہوئے فرمایا: یہ دونوں (یعنی قرآن و عترت) اِن دونوں کی طرح ہیں، یعنی جس طرح دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اسی طرح قرآن و عترت میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے ہاتھ اُٹھا کر شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کو آپس میں ملاتے ہوئے فرمایا: یہ دونوں اِن دو انگلیوں کی طرح نہیں ہیں کہ جن میں سے ایک بڑی اور دوسری چھوٹی ہے۔ پس تم اِن دونوں سے متمسک رہو۔۔۔[1]

آپؐ نے عترت کی اہمیت بیان فرمائی اور فریضۂ حج کی انجام دہی کے فوراً بعد مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ دورانِ سفر غدیرِ خُم نامی ایک ایسے سہ راہے پر آپؐ رُک گئے جہاں سے مدینہ منورہ اور یمن کا راستہ جدا ہوتا تھا۔ راویوں نے لکھا ہے کہ اس وقت موسم اتنا گرم تھا کہ اگر گوشت کا کوئی ٹکڑا زمین پر رکھ دیا جاتا تو کباب بن جاتا۔ ایک ایسی کیفیت میں حضور اکرمؐ ایک اونچی جگہ تشریف فرما ہو جاتے ہیں تاکہ تمام لوگ آہستہ آہستہ جمع ہو سکیں اور جب آپؐ نے دیکھا کہ تمام لوگ جمع ہو گئے ہیں تو آپؐ نے ''مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهَذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ''[2] کا اعلان فرمایا اور امیر المومنین حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر اتنا بلند کیا کہ سارے لوگ دیکھ سکیں۔ متعدّد روایات میں ہے کہ رسول

۱۔ ''إِنِّي قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا، كِتَابَ اللهِ وَ عِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي فَإِنَّ اللَّطِيفَ الْخَبِيرَ قَدْ عَهِدَ إِلَيَّ أَنَّهُمَا لَنْ يَفْتَرِقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ كَهَاتَيْنِ وَ جَمَعَ بَيْنَ مُسَبِّحَتَيْهِ وَ لَا أَقُولُ كَهَاتَيْنِ وَ جَمَعَ بَيْنَ الْمُسَبِّحَةِ وَ الْوُسْطَى فَتَسْبِقَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى فَتَمَسَّكُوا بِهِمَا لَا تَزِلُّوا وَ لَا تَضِلُّوا وَ لَا تَقَدَّمُوهُمْ فَتَضِلُّوا'' (الکافی، ج۲، ص۴۱۵)

۲۔ جس جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔ (کافی، ج۱، ص۴۲۰)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

اکرم ﷺ نے لوگوں کو دکھانے کے لیے حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کو اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغل کی سفیدی نظر آنے لگی۔ یہ اس واقعہ کا اجمالی پہلو ہے۔

اِس واقعے کا دوسرا پہلو جو میرے پیشِ نظر ہے (اس کا تعلق بین الاقوامی اسلامی اور بین الفِرَقِ اسلامی کی جہت سے ہے۔ جو صرف اہلِ تشیع سے مخصوص نہیں ہے) وہ پہلو یہ ہے کہ فرض کیجئے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے اِس اعلان میں، جو کہ یقیناً ہوا تھا اور یہ جملہ آپؐ کی زبانِ مبارک سے جاری ہوا تھا اگر بالفرض حضرت علی علیہ السلام کی خلافتِ بلافصل کا اعلان نہیں کیا تھا، تب بھی کم از کم اتنا تو ثابت ہے کہ آپؐ نے تمام مسلمانوں کو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اور اپنی عترتِ طاہرہؑ کے ساتھ دوستی اور محبت کا حکم دیا ہے اور اس لیے آپؐ نے اپنی عترتِ طاہرہؑ کو قرآن مجید کے ساتھ ساتھ قرار دیا ہے۔ آپؐ اپنے ''منیٰ'' کے خطبے میں اور حدیثِ ثقلین میں بھی (کہ حدیثِ ثقلین کو حضور اکرم ﷺ نے ظاہراً متعدّد بار بیان فرمایا ہے) اور اسی طرح حدیثِ غدیر اور واقعۂ غدیر میں بھی امیر المومنین علی علیہ السلام کی شخصیت کا تعارف کراتے ہیں۔ اس تاکید کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ مسلمان اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ اپنا تعلق برقرار رکھیں۔ کیونکہ ہر زمانے میں انسانوں کو ایک کامل نمونے کی ضرورت ہے، اس لیے آپؐ چاہتے تھے کہ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے آئندہ آنے والی نسلوں اور تمام مسلمانوں کے سامنے ایک انسانِ کامل کو مجسم صورت میں لوگوں کے سپرد کرکے جائیں تاکہ لوگوں سے یہ کہہ سکیں کہ اسلامی تربیت کے لیے ان کی طرف رجوع کریں، یعنی ایک مسلمان کو چاہیے کہ ایسی شخصیات کو اپنے لیے نمونہ عمل قرار دے جن کی طہارت اور پاکیزگی، جن کا علم، زُہد و تقویٰ، جن کے نیک اعمال، جن کی اللہ کے حضور عبادت، مسلمانوں کو درپیش مسائل سے جن کی آگاہی، جن کی قربانیاں، جن کی شجاعت اور بہادری کے بے مثال کارنامے اور اسی طرح اسلام کی خاطر اپنی جان پر کھیلنے کا عملی اظہار سب کے سامنے واضح ہو۔ یعنی آپؐ، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو ایک رول ماڈل اور نمونے کے طور پر تمام مسلمانوں کے سامنے متعارف کراتے ہیں۔ وہ مسلمان چاہے اُس دور کے ہوں یا آئندہ آنے والے ہوں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ حضرت امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے ساتھ اپنا تعلق جوڑے رکھیں۔ اب ہوا یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد عملی طور پر امیر المومنین امام علی علیہ السلام خلیفہ بلافصل

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

نہیں بن سکے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے پچیس سال بعد آپؑ خلیفہ و جانشین بنے۔ پھر بھی آپؑ کے خلیفہ و جانشین بن تو گئے، یعنی آپؑ کا مقام امامت ثابت ہو کر رہا۔ آخر کار تمام مسلمانوں نے آپؑ کو اپنا حاکم اور پیشوا تسلیم کر ہی لیا۔ آپؑ کی یہی خصوصیت، یہی تعلق کہ جسے تمام مسلمان اپنا حاکم و سربراہ اور خلیفۂ رسول ﷺ مانتے ہیں (ہاں البتہ شیعہ آپؑ کو پیغمبر ﷺ کا خلیفۂ بلافصل مانتے ہیں جبکہ بعض لوگ پچیس سال بعد خلیفہ تسلیم کرتے ہیں) اور ایک ایسی شخصیت کہ جسے تمام مسلمان جانشینِ پیغمبر اکرم ﷺ مانتے ہوں، اُس کو تمام مسلمانوں کے لیے ایک کامل نمونہ اور رول ماڈل کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ اور باقی رہنا چاہیے۔ اسی طرح اُس کے اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان رابطے اور تعلقات بھی ہمیشہ قائم و دائم رہنے چاہئیں اور فکری، روحانی اور نظریاتی تعلقات کا تسلسل بھی قائم رہنا چاہیے۔

پس اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو امیر المومنین امام علی علیہ السلام کا تعلق صرف اہلِ تشیع سے نہیں، بلکہ آپؑ کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے، اسی طرح صرف امیر المومنین امام علی علیہ السلام ہی نہیں، بلکہ پیغمبر اکرم ﷺ کے سارے اہل بیتؑ اور ائمہ معصومین علیہم السلام جو امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی اولاد ہیں، سب عترتِ رسول اکرم ﷺ ہونے کے ناطے تمام مسلمانوں کے لیے انسانِ کامل کی حیثیت سے نمونۂ عمل ہیں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے قرآن مجید اور اہل بیت علیہم السلام کے باہمی تعلق اور مسلمانوں اور عترت کے درمیان باہمی رابطے کو بیان فرما کر درحقیقت تحریفِ قرآن اور قرآن کے اصلی مفاہیم سے انحراف و دوری کے مسئلے سے بھی لوگوں کو آگاہ کر دیا ہے۔

کیونکہ جس معاشرے میں حکومتی اہل کار اپنی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے اسلامی تعلیمات اور قرآنی مفاہیم میں ردّ و بدل کرتے ہوں، مسلمانوں کو گمراہ اور مسلمانوں کے صحیح اسلامی احکامات اور تعلیمات سیکھنے اور سمجھنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہوں، وہاں مسلمانوں کو حقیقت سے باخبر رکھنے کے لیے ایک مرجع اور مرکز کا ہونا ضروری ہے کہ جو لوگوں کو بتائے کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ؟ تاکہ لوگوں کو گمراہی سے بچایا جا سکے اور یہ مرجع اور مرکز،

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

اہل بیت علیہم السلام ہی ہیں۔

یہ وہ بات ہے کہ جسے دنیا کو آج سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آج تمام مسلمان اِس بات کے محتاج ہیں کہ وہ اسلامی معارف کو اہل بیت علیہم السلام سے حاصل کریں، اُن کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ امیر المومنین علی علیہ السلام کے خلیفہ بلا فصل یا دیگر اماموں کی امامت کے قائل ہوں یا نہ ہوں۔ البتہ اہلِ تشیع اس حدیث (حدیثِ ثقلین) سے قطعی استفادہ کرتے ہوئے امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے خلیفۂ بلافصل ہونے پر مکمل ایمان رکھتے ہیں، لیکن جو مسلمان امام علی علیہ السلام کو خلیفۂ بلافصل نہیں مانتے (یعنی برادران اہلِ سنت) انہیں بھی امام علی علیہ السلام اور دیگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے اپنے فکری، عقیدتی اور شعوری رشتے کو ختم نہیں کرنا چاہیے۔ پس اِس پہلو کی روشنی میں غدیر کا واقعہ امیر المومنین امام علی علیہ السلام اور دیگر ائمہ طاہرین علیہم السلام کا تمام مسلمان فرقوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا باعث اور تمام مسلمانوں سے متعلق ہے۔

(۱۴/۰۸/۱۹۸۷ء)

واقعۂ غدیر محض ایک تاریخی واقعہ نہیں۔ بلکہ یہ اسلام کی جامعیت کی ایک علامت ہے۔ اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس سال کے عرصے میں اپنی اور اپنے باوفا اصحاب کی انتھک کاوشوں اور کوششوں سے ایک بالکل ابتدائی اور تعصّبات و خرافات سے آلودہ معاشرے کو ایک ترقی یافتہ اور مہذّب سماج میں تبدیل کر دینے کے بعد، اُمت کے سامنے اپنی رحلت کے بعد کے لیے کوئی منصوبہ اور نصب العین پیش نہ کیا ہوتا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام ناقص رہ جاتا۔ چونکہ زمانۂ جاہلیت کے تعصّبات کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ ان کی بیخ کنی کے لیے ایک طویل مدت درکار تھی۔ ظاہری اعتبار سے سب ٹھیک ٹھاک تھا؛ لوگوں کا ایمان بھی مضبوط تھا۔ البتہ سب کا ایمان ایک جیسا نہیں تھا، ان میں سے کچھ لوگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے ایک، دو سال قبل اسلام لائے تھے اور بعض لوگوں کے اسلام کو ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے ان میں سے بہت سے لوگ اسلام کی جنگی طاقت سے مرعوب ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

البتہ بہت سے لوگ اسلام کی جاذبیت اور معنویت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے مگر سب صدرِ اول کے سچے اور باوفا مسلمانوں جیسے نہیں تھے۔ لہٰذا جاہلیت کے تعصُّبات کی روک تھام اور پیغمبر اسلامﷺ کے بعد اسلام کے صحیح راستے کی ہدایت کے لیے کوئی تدبیر اور انتظام ضروری تھا اگر یہ انتظام نہ ہوتا تو آپؐ کا کام ادھورا رہ جاتا؛ جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیت اِس حقیقت کا واضح اعلان کر رہی ہے: ''اَلۡيَوۡمَ أَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِينَكُمۡ وَأَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِي''[1] یہ اِس بات کی وضاحت ہے کہ اسلام کی نعمت، ہدایت کی نعمت، بنی نوع انسان کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی نعمت، تب ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے جب پیغمبر اسلامﷺ کے بعد کا لائحہ عمل معین ہو۔ یہ ایک طبیعی اور فطری بات ہے۔ پیغمبر اسلامﷺ نے غدیر خم کے موقع پر اِس عمل کو انجام دیا اور حضرت علی علیہ السلام کو اپنی جانشینی کے لیے نامزد کر دیا، جو ایمان اور گفتار و کردار میں ایک ممتاز، منفرد اور مثالی شخصیت کے حامل تھے اور سب مسلمانوں پر ان کی اطاعت اور پیروی کو لازم قرار دیا۔ البتہ یہ پیغمبر اسلامﷺ کا ذاتی اقدام نہیں تھا، بلکہ آپؐ کے دیگر احکامات اور فرمودات کی طرح یہ کام بھی وحیِ الٰہی کے ذریعہ انجام پایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی علیہ السلام کو عہدۂ امامت پر فائز کیا اور پیغمبر اسلامﷺ کو اس کے اعلان کا واضح اور دوٹوک پیغام دیا۔ پیغمبر اکرمﷺ نے اس پر من و عن عمل کیا۔

غدیر ایک حقیقت کا نام ہے۔ واقعہ غدیر دینِ اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلام کے مستقبل کا ضامن ہے اور ان شرائط کو واضح کرتا ہے جو اُمتِ اسلامیہ کی زعامت اور قیادت کے لیے لازم ہیں۔ وہ کونسی شرائط ہیں؟ وہ وہی شرائط ہیں جو امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی ذاتِ والا صفات میں جلوہ گر تھیں، یعنی پرہیزگاری، دینداری، دین کی غیر مشروط پابندی، خدا اور حق کے راستے کے سوا کسی کو خاطر میں نہ لانا، خدا کی راہ میں بےخوف و خطر چلنا، علم و عقل و تدبیر سے مزیّن ہونا، عزم و ارادہ کی طاقت سے آراستہ ہونا۔ غدیر ایک حقیقت ہے لیکن اس کا ایک اشارتی اور علامتی پہلو بھی ہے۔ امیر المومنین امام علی علیہ السلام کو انہیں خصوصیات کے پیش

۱۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمتوں کو تم پر تمام کر دیا ہے۔ (سورہ مائدہ، آیت ۳)

Presented by: https://jafrilibrary.com/

Presented by: https://jafrilibrary.com/

نظر نامزد کیا گیا۔ یہ خصوصیات اسلام کی زندگی کے مختلف ادوار میں اسلامی قیادت اور زعامت کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

اُمت ِاسلامیہ کے رہبروں اور حکومت کے ذمہ داراں کے لیے انہیں خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے جو حضرت امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے انتخاب میں کارفرما تھیں۔ غدیر انہیں امتیازات اور خصوصیات سے معمور ایک حقیقت کا نام ہے۔

(۲۰۰۷/۰۱/۰۸ء)

Presented by: https://jafrilibrary.com/